مغالطے مبالغے

مبارک حیدر

جن کا دیں پیروی کذب و ریا ہے ان کو
ہمت کفر ملے، جرأت تحقیق ملے
جرأت تحقیق

جن کا دیں پیروی کذب و ریا ہے ان کو
ہمت کفر ملے، جرأت تحقیق ملے
RealisticApproach.org Proxy Link: bit.do/jurat
جرأت تحقیق

مغالطے مبالغے

مبارک حیدر

Jurat-e-Tehqiq

سانجھ

Jurat-e-Tehqiq
جرات تحقیق www.RealisticApproach.org جرات تحقیق

ہر اس شخص کے نام

جو اس کڑے وقت میں

علم اور بقا کی تلاش میں ہے

جن کا دیں پیروی کذب و ریا ہے ان کو
ہمت کفر ملے، جرأت تحقیق ملے
Jurat-e-Tehqiq
RealisticApproach.org Proxy Link: bit.do/jurat
جرأت تحقیق

فہرست

1	بحث کا جواز	9
2	مبالغے اور مغالطے	13
3	اسلامی سلطنت کا مغالطہ	17
4	پارسائی کا مبالغہ	29
5	آزاد میڈیا کا مبالغہ	38
6	عدلیہ کے تقدس کا مبالغہ	53
7	علم کی ملکیت کا مبالغہ	62
8	نگران جماعت کا مغالطہ	71
9	قیام خلافت کا مغالطہ	82
10	اسلام دشمنی کا مبالغہ	91
11	مغربی تہذیب کا مغالطہ	97
12	سیکولرازم کا مغالطہ	109
13	اختتامیہ	138

جن کا دیں پیروی کذب و ریا ہے ان کو
ہمت کفر ملے، جرأت تحقیق ملے
RealisticApproach.org Proxy Link: bit.do/jurat
Jurat-e-Tehqiq

بحث کا جواز

مبالغہ یوں تو کسی حقیقت کو اس کی اصل سے بڑھا کر بیان کرنے کا نام ہے، جو کہ ہم روز مرہ گفتگو میں اکثر استعمال کرتے ہیں۔ کہانی، شاعری اور طنز مزاح میں اس کا استعمال فطری سمجھا جاتا ہے لیکن ایسے معاملات میں مبالغہ سے پرہیز ضروری سمجھی جاتی ہے جن کا ادراک درست اور معروضی انداز سے کرنا ضروری ہو۔ لہذا سنجیدہ معاملات میں مبالغے الجھنیں پیدا کرتے ہیں۔

سنجیدہ معاملات میں مبالغہ آمیزی کی نفسیات کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس کے پیچھے یا تو تکبر و نخوت یا کسی کمی کا کوئی احساس کارفرما ہوتا ہے، جسے پورا کرنے یا نظر انداز کرنے کے لئے مبالغہ ایک خود فریبی کا کام دیتا ہے۔

ہماری اجتماعی نفسیات پر نرگسیت کا آسیب آہستہ آہستہ یوں غالب ہوا ہے کہ تجزیہ، خود تنقیدی اور خود احتسابی ہماری اجتماعی زندگی کے لئے اجنبی ہو گئے ہیں۔ فرد ہو یا معاشرہ اگر صحت مند ہو تو اپنے عمل کے نتائج کا جائزہ لیتا ہے۔ جانور کی جبلت اور انسان کی ذہانت کا فرق اسی صلاحیت کے ہونے نہ ہونے سے واضح ہوتا ہے۔ دیوار پر کیڑے کا بار بار چڑھنا، گرنا اور پھر چڑھنا ثابت قدمی کی مثال کے طور پر صدیوں سے بیان ہوتا رہا ہے، لیکن انسان کی ثابت قدمی کا اظہار بالکل ہو بہو اسی طرح نہیں ہوتا۔ مریخ پر بھیجی جانے والی خلائی گاڑی کو ہر ناکامی کے بعد پھر ویسا ہی نہیں بنایا جاتا، نہ ہی ہر بار ہر عمل کو اسی طرح دہرایا جاتا

ہے۔حیوان اور انسان کے سیکھنے کا عمل اپنے بنیادی وصف کے اعتبار سے الگ ہے۔حیوان ان گنت شکستوں کے بار بار عمل میں بس تھوڑا سا سیکھتا ہے،اس کا طرز عمل بدلتا ضرور ہے لیکن بہت اذیت ناک اور طویل دہرائیوں کے بعد۔انسانی ذہانت اس سے یکسر مختلف وصف ہے۔یہ انسانی دماغ کی وہ صلاحیت ہے جس سے ہم حقیقی وقت میں حقیقت کی درست تصویر تیار کرتے ہیں،تاکہ پیش آنے والی صورتحال سے بروقت نمٹ سکیں۔یوں ذہن کی یہ صلاحیت کم سے کم تین شرائط پوری کرتی ہے۔

1۔حقیقت کی ذہنی تصویر تیار کرنا

2۔درست تصویر تیار کرنا،یعنی حقیقت کا درست ادراک کرنا

3۔حقیقی وقت میں یہ عمل مکمل کرنا یعنی اتنی تیزی سے کہ درپیش مسئلہ حل ہو جائے قبل اس کے کہ اس مسئلے سے مزید مسائل پیدا ہوں۔۔۔۔

اس عمل کو شائد مندرجہ ذیل مثال سے واضح کیا جا سکے۔

آپ اپنے گھر کے ایک کمرے میں بیٹھے ہیں،تیز بارش ہو رہی ہے،اچانک دیوار کے ایک مقام سے پانی رسنے لگتا ہے۔دیکھتے ہی دیکھتے رستے پانی کی رفتار بڑھ کر دھار بن جاتی ہے۔آپ نے صبح کی خبروں میں پڑھ رکھا ہے کہ شہر کے قریب والے ڈیم میں پانی کی سطح بہت بلند ہو رہی ہے اور ڈیم کو خطرہ ہے۔آپ ذہن میں تصویر بناتے ہیں کہ ڈیم ٹوٹ چکا ہے جس کا پانی دیوار توڑ کر اندر آ رہا ہے۔آپ جھانک کر دیکھتے ہیں بارش کا پانی دکھائی دیتا ہے لیکن برآمدہ کی سطح سے نیچے ہے۔آپ غور کئے بغیر قیمتی سامان سمیٹنے لگ جاتے ہیں تاکہ اسے اوپر والی منزل میں لے جا سکیں۔یا آپ ریسکیو پولیس کو فون کرتے ہیں۔

ان کے آنے پر پتا چلتا ہے کہ نہ تو ڈیم ٹوٹا ہے نہ شہر میں کہیں پانی سے پریشانی موجود ہے۔لیکن اس دوران کمرے میں آنے والا پانی آپ کے قالین اور فرنیچر کے بعض حصوں کو تر کر چکا ہے اور دیوار پر جا بجا پینٹ کے بگڑنے کے آثار موجود ہیں جو دوبارہ پینٹ

کے بغیر ٹھیک ہونے والے نہیں۔ظاہر ہے آپ نے حقیقت کی جو تصویر تیار کی تھی وہ درست نہیں تھی۔ یہاں ذہنی صلاحیت کی پہلی شرط تو پوری ہوئی یعنی آپ نے حقیقت کی کوئی تصویر بنائی لیکن وہ تصویر درست نہ تھی۔تیسری شرط بھی آپ نے پوری کی یعنی آپ کا ردعمل بھی آپ کی بنائی ہوئی تصویر کے مطابق تیز اور فوری تھا۔لیکن اس سے حاصل ہونے والے انتظامات مہمل اور بے کار ثابت ہوئے کیونکہ اس اثنا میں آپ کے کمرے کو کافی نقصان پہنچ چکا تھا،جس کا ازالہ کرنے کے لئے آپ کو مزید اقدامات کرنے پڑے ہوں گے۔

اب اسی صورت حال میں آپ اگر یہ سوچتے کہ دیوار میں سے گزرتا ہوا پانی کا پائپ پھٹ گیا ہے اور آپ فوری طور پر پانی کے مرکزی کنکشن کا وال بند کر دیتے تو آپ کا عمل حقیقت کی تصویر بنانے ،درست تصویر بنانے اور حقیقی وقت میں درست تصویر بنانے کا عمل ہوتا لیکن اگر آپ وال بند کرنے کی بجائے پلمبر کو فون کرتے یا پھر اسے بلانے نکل کھڑے ہوتے یا اڑوس پڑوس کے لوگوں سے رائے لینے کے بعد بالآخر وال بند کرتے، جبکہ رستا ہوا پانی بہت سے اور مسائل پیدا کر دیتا تو آپ کا یہ عمل حقیقی وقت کی شرط پوری نہ کرتا۔

حقیقی وقت میں درست فیصلے کرنے کی صلاحیت بڑھتے بڑھتے اتنی عمدہ ہو سکتی ہے کہ ہم ہونے والے واقعات کی پیش گوئی کر سکیں۔یعنی پانی کا پائپ پھٹنے اور وال بند کرنے کا مرحلہ آنے سے کہیں پہلے اس پائپ کو بدل دیا جائے جو ایک مرحلہ پر پھٹے گا۔یہ جاننا کہ پائپ کب پھٹے گا، ایسے علم کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے جو انسانی ذہانت کے جمع ہونے سے آتا ہے۔

زندگی کے ہر شعبہ میں سسٹم کو سنجیدگی سے رائج کرنے کے یہ معیار منظم معاشروں کا معمول بن گئے ہیں۔جہاں ہم جیسے معاشرے وہم اور تصورات کی بنیاد پر فیصلے کر رہے ہیں وہاں دنیا کے اکثر معاشرے زندگی کے حقائق کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا ایک بنیادی فرض کے طور پر قبول کر چکے ہیں۔

آنے والے وقتوں میں بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کے لئے ہوا اور پانی سے لے کر اعلیٰ ترین سہولتوں تک کی فراہمی کیسے ممکن ہو یہ سوچنا اور اس کا اہتمام کرنا آج کے ذہین معاشروں کا نصب العین ہے۔ یہ ذہانت مبالغوں اور مغالطوں سے نکلے بغیر میسر آ ہی نہیں سکتی۔ کیا ذہانت کے ان معیارات کو ہم نے کبھی توجہ کے لائق سمجھا ہے؟ کیا ہمیں مغالطوں اور مبالغوں سے نکلنے کی ضرورت ہے؟ اگر ایسا ہے تو وہ مبالغے اور مغالطے کیا ہیں جن کی وجہ سے ہم سمیت ہمارے مسلم معاشرے درست طرز فکر سے محروم ہوئے ہیں؟

یوں تو مبالغوں اور مغالطوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن اس کتابچہ میں چند ایک پر غور کی دعوت دی گئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری اس دعوت کو خلوص نیت سے قبول کیا جائے گا اور اہل علم اس میں ہماری ایسی راہنمائی کریں گے جس سے مسائل کا حل نکلے۔

مبالغے اور مغالطے

کہا جاسکتا ہے کہ مبالغے تکبر اور مغالطے کم علمی کی اولاد ہیں۔ جب تحقیق اور تجزیہ خود پسندی کے ماحول میں ہو اور فیصلے پہلے سے لکھ کر رکھ لئے جائیں تو پھر مغالطوں اور مفروضوں کو فارمولے کا مقام حاصل ہوجاتا ہے۔ اور اسے استعمال کرنے والے اپنی دانست میں مفروضے کو سنگولیریٹی (singularity) تصور کر لیتے ہیں جو ریاضی کے ایسے مرحلوں پر استعمال ہوتی ہے جہاں کوئی بڑی رکاوٹ آجائے۔

ہمارے ہاں یوں تو تقریباً ہر میدان میں مغالطے راج کرتے ہیں، چاہے فوجی افسروں کا Men at their best کی حیثیت سے حکومت کرنے کا معاملہ ہو، دولت مند کا سماجی احترام مانگنے کا یا ہیرا پھیری کو عملی سیاست کہنے کا لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مغالطے حقیقی دنیا میں شکست کا باعث بنتے چلے جارہے ہیں اور بنیادی اصلاح کے بغیر ان میں سے کسی قوت کا صالح ہونا ممکن نہیں۔ صالح کے مفہوم پر بھی ہمارے ہاں زبردست مغالطے چلے آتے ہیں جس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ صالح صحیح کو جنم دیتا ہے، صحت کی طرف بڑھاتا ہے۔ ہمارے ہاں کیا ہوا ہے اور ہورہا ہے، سامنے ہے۔ لیکن حقائق کی اذیت سے بچنے کیلئے ہماری قومی ٹکنیک یہ ہے کہ خرابی ہمیشہ کسی اور پر ڈال دی جائے یا اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے۔ اس عمل کے لئے ایک اور سنگولیریٹی استعمال کرلی جاتی ہے یعنی یہ کہہ کر سوال کا جواب نکل آتا ہے کہ ''خرابی ہے کہاں؟ سب ٹھیک تو ہے، مایوس ذہنوں کو تو عادت ہے عیب جوئی

کی''..... کیونکہ جس کی نظر میں سب ٹھیک ہے اس کا فارمولا یہ ہے کہ اگر میں فٹ ہوں تو سب ٹھیک ہے۔ فٹ ہونے کے بھی ذاتی معیار ہیں: مال میں فٹ، اقتدار میں فٹ۔ موقعہ کی مناسبت سے فٹ کے معانی بدلتے رہتے ہیں۔ جس سے پورا معاشرہ فٹ یا ان فٹ نظر آتا ہے۔

کسی نے تجویز کیا کہ معاشرہ کی صحت کا اندازہ لگانے کے لئے معروضی حالات کے اعداد و شمار دیکھ لیں۔ جرائم بڑھے یا کم ہوئے، سرکاری غیر سرکاری سطح پر کرپشن، قانون شکنی میں اضافہ ہوا یا کمی۔ ملکی اقتصادیات کیسی ہے، سیاسی اصول کیا ہیں، سماجی فضیلتوں کا معیار کیا ہے، علمی قابلیت، صحت عامہ، اجتماعی اور انفرادی اخلاق، ٹریفک، عورتوں اور کمزوروں کا احساس تحفظ یہ سب کیسا ہے۔

دینی علما کا دعویٰ ہے کہ ہم اس لیے مسائل میں گھر گئے ہیں کیونکہ ہم نے اسلام کو چھوڑ دیا۔ ہمارے مسلم علما کی ایک خصوصیت اُن کی ثابت قدمی ہے یعنی یہ ایک ہزار برس کے دوران اپنے خیالات سے ایک انچ نہیں ہلے۔ جب 1256ء میں ہلاکو نے بغداد کو تاراج کیا تو ہمارے دینی علما نے تب بھی یہی کہا تھا کہ ہماری شکست کا سبب یہ ہے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ دیا۔ معلوم نہیں ہم نے اسلام کو کب پکڑا اور کب چھوڑ دیا لیکن یہ طے ہے کہ ہمارے علما کی فضیلت میں کمی نہیں آئی۔

اس کے برعکس احیائے اسلام اور دعوت اسلامی کی تحریکوں کا دعویٰ ہے کہ ہر سال چھ لاکھ سے زائد طلبا اسلامی درسگاہوں یعنی مدرسوں سے فارغ التحصیل ہوکر معاشرے میں اچھائی کی ترویج اور برائی کے سد باب کے لئے مصروف ہوجاتے ہیں۔ جبکہ مختلف دینی اجتماعات میں سالانہ پچاس لاکھ سے زائد افراد دینی تربیت سے گزرتے ہیں۔ یونیورسٹیوں، کالجوں اور سکولوں میں دین کے چرچے ہیں، اسلامی شریعت اور سنت رسول کی ترویج کے لئے طاقتور تحریکیں چلی ہوئی ہیں۔ یوں ضیاء الحق مرحوم کے دور سے اب تک چالیس برس میں

تقریباً دو کروڑ دینی طالبعلم یا سکالر فارغ التحصیل ہوئے ہوں گے اور اجتماعات میں دس کروڑ سے زائد افراد جذبہ دینی سے سرشار ہوکر اس معاشرے میں سرگرم عمل ہو چکے۔ اجتماعاتِ جمعہ سے متاثر ہونے والے افراد اور ہر سال کے حجاج کرام اس کے علاوہ ہیں۔ پھر مختلف دینی تہواروں اور نعتیہ اجتماعات کے اثرات بھی تو کچھ ہوتے ہوں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان متعدد دینی سرگرمیوں میں شریک خواتین و حضرات کا لب و لہجہ اور ان کا معاشرے میں مقام واضح طور پر فیصلہ کن حتیٰ کہ تحکمانہ ہو چکا ہے۔ مثلاً نماز جمعہ یا کسی دوسرے دینی اجتماع کے لئے سڑک پر اگر ٹریفک بند کر دی گئی ہو تو کسی شہری کو جرات نہیں ہو سکتی کہ یہ اعتراض کرے کہ سڑک کو بند کرنے کا یہ عمل قانوناً درست نہیں۔ اس کے باوجود علما کا اصرار ہے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے۔

کیا یہ پوچھنا جائز نہیں کہ اس سارے دینی ابھار اور اتھارٹی کے باوجود اور معاشرے میں گیارہ کروڑ کے قریب افراد کے دین سے اعلانیہ وابستہ ہونے کے باوجود معاشرہ کے تمام معاملات میں انحطاط کا اضافہ اور بڑھتی ہوئی لاقانونیت کی آخر کیا وضاحت ہے؟ کوئی تو آزار ایسا ہے جو جسم کو غذا کے اثر سے محروم کیے رکھتا ہے۔

وہ آزار کیا ہے اس کی نشاندہی اتنی آسان اور سادہ نہیں۔ تاہم یہ کہنا ممکن ہے اگر حالت یہ ہو کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، تو حکیم صاحب کی خدمت میں اتنا عرض کرنا شاید گستاخی نہ ہو کہ دوا کو ذرا پھر دیکھ لیں کوئی ملاوٹ تو نہیں۔ یا یہ کہ کہیں اس مرض کی دوا کوئی اور تو نہیں۔ کہیں آپ کسی اور مرض کی دوا اس مرض کے لئے تو نہیں دیتے جا رہے جو اس معاشرے کو لگا ہوا ہے۔ یعنی کہیں یہ تو نہیں کہ آپ سمجھتے ہیں کہ اس معاشرے کو دین کی ضرورت ہے اور فکری اختلاف پر پابندیوں کی ضرورت ہے اور حقیقت یہ ہو کہ اسے علم کی اور جدید افکار کی ضرورت ہے۔۔۔

اگر یہ کہا جائے کہ دینی تحریکوں سے وابستہ یہ دس گیارہ کروڑ سے زائد خواتین و

حضرات اس لیے معاشرے پر کوئی بہتر اثر نہیں ڈال سکے کیونکہ حکومت ان کے ہاتھ میں نہیں تو یہ سچ نہ ہوگا۔ یہ اس لیے سچ نہیں ہوگا کہ ان باکردار لوگوں کو اپنے کردار سے اگر چند لوگوں نے روک رکھا ہے تو کیوں ایسا ہے کہ یہ دس گیارہ کروڑ لوگ اپنے ووٹ کے ذریعے دینی جماعتوں کو اقتدار تک نہیں پہنچاتے۔ جب کہ یہ گیارہ بلکہ سولہ کروڑ لوگ ہمارے اسلامی رہنماؤں کے کسی فیصلہ سے اختلاف کی جرأت بھی نہیں کرتے۔ تو پھر کیا ہم سب ریاکار یا منافق ہیں؟ اگر ہم نسل در نسل ملنے والی تمام تر دینی تعلیم کے باوجود منافق ہیں تو کیوں؟ کیا اس کا سبب یہی تو نہیں کہ اختلاف کا حق نہیں؟ کیا جبر سے ایمان پیدا ہو سکتا ہے؟

Jurat-e-Tehqiq

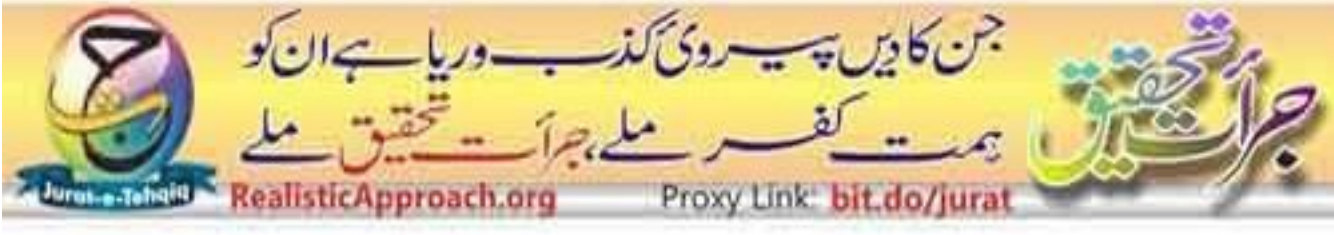

اسلامی سلطنت کا مغالطہ

ایک نہایت اہم اور غور طلب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سچ ہے کہ اسلام کا بنیادی مقصد نہ تو سلطنت کا قیام تھا نہ مال و متاع کا حصول؟ اور کیا یہ سچ ہے کہ تمام مذاہب انسان کی تہذیبِ نفس کے لئے قائم ہوئے؟ انسانی وسائل کی تنظیم اور تربیت ہر مذہب کا بنیادی مینڈیٹ تھا اور اسلام سب سے بڑھ کر اس مقصد کو پورا کرنا چاہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے اہم ترین کام عربوں کے انسانی وسائل کی نشوونما تھا نہ کہ مملکت کا قیام۔ لیکن چونکہ عربوں کے نظامِ زندگی میں مملکت کا عنصر انتہائی پسماندہ بلکہ تقریباً ناپید تھا اور چونکہ قبائلی طرزِ حیات میں انسانی صلاحیتوں کا عروج ممکن نہ تھا، اس لئے آپ کو ایک مملکتی نظام بھی تشکیل دینا پڑا تاکہ ایک بڑے اجتماعی نظام میں آ کر لوگ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکیں۔ یہ بات نہایت اہم ہے کہ مملکت کا قیام عربوں کے اُس وقت کے سیاسی حالات میں بے حد ضروری تھا، کیونکہ یہ مرکز گریز معاشرہ بدامنی، بدحالی اور انتشار سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن اسلام نے صرف ایک اجتماعی سیاسی نظام کی بنیاد رکھی، جبکہ اس کے اداروں اور عملی شکلوں کا کوئی ایسا مستقل خاکہ نافذ نہیں کیا جس میں تبدیلی مشکل ہو جائے۔ یعنی قرآن کے اخلاقی، تہذیبی اور روحانی آئین کے ماتحت رہتے ہوئے انسانوں کو اپنا نظامِ حکومت بنانے کی آزادی دی گئی۔ اگر مملکت پہلے سے موجود ہوتی تو قرآن اور نبی دونوں کے پیشِ نظر صرف انسانوں کے کردار اور صلاحیتوں کی نشوونما کا واحد مقصد رہ جاتا، جیسا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے

سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے، کہ چونکہ وہاں مصر اور روم کی سلطنتیں موجود تھیں لہٰذا ان محترم انبیا نے کوئی مملکت قائم نہیں کی بلکہ صرف انسانوں کی تربیت اور معاشرے کی اخلاقی تنظیم کا کام سرانجام دیا جس کے ساتھ ہی انسانی حقوق کا تعین بھی کیا گیا۔

اس نقطہ نظر کے حق میں کیا دلائل ہیں؟ سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ اسلام جن معاملات کو جتنی اہمیت دیتا ہے، قرآن اور اسوۂ رسول اُس پر اتنا زور دیتے ہیں۔ کوئی بات اگر بنیادی اہمیت کی حامل ہے تو قرآن اور اسوۂ رسول دونوں میں موجود ہو گی اور اسے اِس کی اہمیت کے حساب سے بار بار کہا اور کیا گیا ہو گا۔ جو بات اجتماعی اہمیت کی حامل نہیں یعنی لوگوں کی تربیت سے اس کا تعلق نہیں، اس کا حکم قرآن میں نہیں آتا، چاہے رسول اللہ ﷺ کے عمل میں موجود بھی ہو۔

مثلاً رسول اللہ ﷺ کی نجی زندگی کے وہ پہلو جنھیں قرآن نے کسی ضابطہ یا قاعدہ کے طور پر لوگوں کے لئے مقرر نہیں کیا۔ حضور ﷺ کا وحی وصول کرنا اور اسے بیان کرنا صرف ایک ایسا موضوع نہیں بلکہ حضور ﷺ کا کم کھانا اور کم سونا ایسے اعمال ہیں جن کو قرآن نے عام انسانی زندگی کا نصاب نہیں بنایا، حالانکہ انہوں نے عمر بھر ان پر عمل کیا۔ اسی طرح حضور ﷺ کا مالدار نہ ہونا اور بسا اوقات سخت تنگدستی میں زندگی گزارنا آپ کا وہ عمل ہے جو لوگوں کے لئے ضروری نہیں کیا گیا۔ ایسا ہی ایک پہلو حضور ﷺ کے ذاتی لباس یا حُلیہ کا ہے جس میں ریش مبارک اور بالوں کا کوئی انداز آپؐ کے ذاتی حُلیہ مبارک میں آتے ہیں جو آپؐ نے ہمیشہ اپنائے لیکن قرآن نے مسلمانوں کے لئے اس سنتِ نبویؐ کا کوئی حکم نہیں دیا۔ اس کے برعکس نبیؐ کا غور و فکر کرنے کا عمل ہے جو آپؐ نے جوانی کے ابتدائی دور سے اپنایا اور عمر بھر اسے اپنائے رکھا۔ قرآن نے اِس عمل کو انسانوں کے لئے انتہائی اہمیت دی اور سینکڑوں آیات کا اختتام ایسے سوالات یا ترغیب سے ہوتا ہے جس کا ایک ہی مقصد و مفہوم ہے: غور و فکر، جستجو، تدبر اور دانش۔

اسی طرح حضورﷺ کی ازدواجی زندگی آپؐ کے لئے مخصوص تھی یعنی قرآن نے وہ حقوق اور ضابطے عام مسلم عورتوں کے لئے قائم نہیں کئے، جو امہات المومنین کے لئے تھے، یا آپ کا حق تھے (الاحزاب، آیت نمبر 53-50)۔ یہ بھی اسوہ کا وہ حصہ ہے جو لوگوں کے لئے سنت نہیں، جبکہ لوگوں کی ازدواجی زندگی کی حدیں قرآن نے بیان کی ہیں جن پر رسول اللہ ﷺ نے بھی عمل کیا۔ قرآن نے ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت کا بیان مختصر طور پر کیا اور جابجا اس کا اعادہ نہیں کیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حق اسلام کا نمایاں مقصد نہیں، جبکہ اللہ اور اُس کی وحدانیت کا بیان قرآن اور رسولؐ کے الفاظ میں بے حد تواتر سے آتا ہے۔ انسانی تربیت کا یہ نہایت اہم جزو ہے جو نبی کی زندگی میں بھی اسی اہمیت کے ساتھ کارفرما رہا ہے۔

اسلام کے ایسے پہلو جن پر قرآن خاموش ہے لیکن رسول اللہﷺ کے عمل میں اُن کی مختلف شکلیں ملتی ہیں، خصوصی غور کا تقاضا کرتے تھے۔ لیکن یہ امر امت مسلمہ کے لئے الجھنوں کا باعث بنا کہ ہمارے اہم ترین ائمہ کرام اور علما ایسے معاملات پر توجہ نہ دے سکے۔

اِن معاملات میں سے سب سے اہم مملکت اور اُس کے اداروں کا سوال ہے۔ مملکت کے اداروں میں انتظامیہ، عدلیہ، مقننہ اور نظامِ دفاع کی بنیادی اہمیت ہوتی ہے۔ مملکت کے یہ ادارے اگرچہ صنعتی دور میں بہت منظم اور نہایت واضح ہو گئے ہیں، تاہم یہ تاریخ کے قدیم ایام میں بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے ہیں۔ مثلاً یونان اور روم کے جمہوری نظام جن میں سے روم کا نظام اس لئے قابل ذکر ہے کہ یہ ایک عالمی مملکت ہونے کے ساتھ ساتھ صدیوں تک جاری رہا تھا۔ عرب اس سے واقف تھے اور خود رسول اللہ نے روم کے بادشاہ کو خط بھجوایا۔ عرب کے دوسری جانب ایران کی مملکت موجود تھی اور اس سے بھی حضورﷺ آگاہ تھے۔ پہلے وقتوں میں اِن اداروں کی موجودہ شکل کے مطابق بنیادی اصول واضح نہ تھے یعنی اختیارات کی تقسیم، اختیارات کی تخصیص اور حد بندی اور صاحبِ اختیار کی مدتِ اختیار کا تعین وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ تقریباً سبھی اختیارات کا مرکز بادشاہ، سردار یا امیر ہوتا تھا۔

اگرچہ مشاورت کی مجبوری لگی رہتی تھی کیونکہ سربراہ کے علاوہ بھی ایسے لوگ ہمیشہ ہوتے تھے جو اپنے حلقۂ اثر یا صلاحیتوں کے باعث اقتدار میں شراکت مانگتے تھے۔ تاہم مرکزی حکمران اپنے طبقۂ اقتدار کی مدد سے سارے ادارے بناتا تھا۔ عدلیہ کا سربراہ بھی وہی، مقننہ بھی وہ خود اور مسلح افواج کا اقتدار بھی اُسی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ مطلق العنان بادشاہوں کے نظام میں تبدیلیاں یونان اور روم کے ادوار میں شروع ہوئیں، جہاں سینٹ کا وجود قائم ہوا جسے طاقتور طبقۂ امرا کا ایک مشاورتی ادارہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ عمل زیادہ لوگوں کی اقتدار میں شمولیت کا عمل تھا جو صدیوں سے آگے بڑھ رہا ہے اور یوں موجودہ زمانہ میں اقتدار میں پورے معاشرے بلکہ بنی نوع انسان کی شمولیت کا تصور آگے بڑھ رہا ہے۔ موجودہ دور میں علم پر مبنی جمہوریت کا نیا تصور سامنے آیا ہے جس کا مؤقف یہ ہے کہ قانون سازی اور فیصلے اِس اصول سے کئے جائیں کہ اختلاف کرنے والے تمام عناصر کو قائل کیا جائے کہ وہ ان فیصلوں کا ساتھ دیں، یا اختلاف کو کم سے کم کرنے کے لئے درمیانی راستے نکالے جائیں۔

اسلام کا دعویٰ نہ تو روم جیسی مملکت کا قیام تھا نہ ایرانی شہنشاہیت کی تقلید۔ یہ انسانوں کی تربیت کے لئے آیا تھا۔ اللہ نے نبیؐ کے مقام کی تخصیص نہ تو بادشاہ کی حیثیت سے کی، نہ ہی فاتح کے طور پر۔ حضور ﷺ کا مقام قیصر و قصریٰ یا سکندر اعظم کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتا اور جو لوگ اس طرح کے کسی مقصد کے لئے اسلام اور رسول اللہ ﷺ کو سند بناتے ہیں وہ آپؐ کے مقام کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ تسخیر اور حکمرانی میں کسی نہ کسی طرح جبر کا پہلو غالب آجاتا ہے، جب کہ رسول اللہ کو جبر سے منع کیا گیا۔ آپ کا منصب جس کی بیسیوں آیات میں وضاحت کی گئی، سیدھی راہ دکھانے والے کا تھا، اللہ کی آیات اور نشانیاں ظاہر کرنے والے کا، پاک کرنے والے کا تھا یعنی کتاب اور دانش سکھانے والے کا۔ ایسی دانش جو لوگ پہلے نہ جانتے تھے۔ یعنی علم و دانش کی راہ پر ڈالنے والے کا منصب آپ ﷺ کا امتیازی منصب ہے۔

کما ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلوا علیکم آیتنا و یزکیکم وہ یعلمکم الکتاب و الحکمۃ و یعلمکم ما لم تکونو اتعلمون (سورۃ نمبر 2، آیت 151)

ترجمہ: جیسے ہم نے تمہارے اندر تم میں سے ہی اپنا رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے اور تمھیں پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب اور دانائی سکھاتا ہے اور تمہیں وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

آپؐ کے اسی منصب کا ذکر تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ سورۃ نمبر 3 کی آیت 164 اور سورۃ نمبر 62 کی آیت 2 میں ہوا ہے، جبکہ بادشاہ یا امیر کے طور پر آپ ﷺ کا منصب ہمارے علم کے مطابق کسی آیت میں بیان نہیں ہوا۔ آپؐ نے سفارت کے لئے جو خط بھیجے ان میں آپؐ نے اپنا منصب رسول اللہ لکھوایا، صلح حدیبیہ کے معاہدہ پر بھی آپؐ نے یہی منصب لکھوانا چاہا، نہ کہ شاہِ مدینہ کا۔

قرآن نے قریش کو مملکت کی کوئی بشارت نہیں دی، نہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کوئی وعدہ کیا۔ سورۂ قریش میں قریشِ مکہ کو سردیوں گرمیوں کے سفر سے مانوس کرنے کا حکم دیا گیا اور خدا کے گھر کی اس برکت کا ذکر کیا گیا، جس کے سبب سے قریش کو تلوار سے پناہ ملی اور بھوک کی موت سے چھٹکارا۔ یعنی یہ انسانی وسائل کی نشوونما کی تلقین تھی۔ سفر تجارت کا بھی ہو سکتا ہے اور فتوحات کا بھی۔ اگرچہ مغرب کے اکثر محققین کے نزدیک یہ آئندہ کی فتوحات کے لئے قریش کو آمادہ و تیار کرنے کا اشارہ تھا، تاہم اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ حضور ﷺ نے قریش کی مملکت کا کوئی وعدہ کیا ہو۔ عربوں کی فکری و تہذیبی یکجہتی، امن و امان اور سلامتی کا معاشرہ تعمیر کرنے کی خواہش اور تجارت کی بحالی سورۂ قریش کا موضوع نظر آتی ہے۔ عربوں کا یہ پسندیدہ پیشہ یعنی تجارت تین سو برس پہلے تک عربوں کی خوشحالی کا سبب تھا اور یہی تجارت اُن کی عظیم مملکتِ سبا اور مملکتِ سلیمان کی بنیاد تھی۔ پورے قرآن میں کہیں کوئی تفصیلی مضمون یا واضح بیان اِس امر کا موجود نہیں کہ عربوں کی کسی ایسی سلطنت کی تعمیر اسلام کا مقصد ہے، جو

جزیرہ عرب سے نکل کر دنیا کو فتح کرے اور تمام تہذیبوں کو مٹا کر صرف عربی تہذیب کا پرچم بلند کر دے۔

یہی سبب ہے کہ اگرچہ نبیؐ نے مدینہ میں اور بعد ازاں جزیرہ عرب میں ایک ریاست یا حکومت کا نظام نافذ کیا، تاہم قرآن نے اس سوال پر مکمل خاموشی اختیار کی، یعنی یہ عربوں کی طوائف الملوکی کے سدِ باب کے لئے اور انہیں ایک مہذب معاشرہ بنانے کے لئے رسول اللہ ﷺ کا اقدام تھا، جو آپؐ نے بطور سربراہ اٹھایا، لیکن مملکت کے اداروں سے متعلق اصول وضوابط اور احکام نہ تو قرآن نے متعین کئے نہ حدیثِ نبویؐ میں ان کا بیان ہوا۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کے بعد ریاست کے سربراہ کا تقرر کیسے ہوگا، کون کرے گا، کتنی میعاد کے لئے ہوگا، اس کے بعد اس کے جانشین کے تقرر کا اصول کیا ہوگا، اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے عدل کا نظام کیا ہوگا، نئے حالات و واقعات میں اجتہاد و مشاورت کی تنظیمی شکلیں کیا ہوں گی، یعنی نئے قوانین بنانے کا اختیار کس ادارہ یا شخص کو ہوگا، افواج کی ساخت اور قواعد کیا ہوں گے، سپہ سالاروں اور فوجی قائدین کی بھرتی اور تعیناتی، اُن کا مقصد اور میعاد کیا ہو گی، اِن امور پر قرآن وحدیث خاموش رہے۔

قرآن حکیم نے روزمرہ زندگی کے چھوٹے بڑے ہر سوال پر اہلِ ایمان کی رہنمائی کی۔ وہ معاملات جو بظاہر معمولی اہمیت کے معاملات سمجھے جاتے ہیں، اُن پر تفصیلی فیصلے دیے۔ مثلاً کسی کے دروازے پر کتنی بار دستک دینا واجب ہے اور جواب نہ ملنے پر مزید دستک نہ دینے کا حکم، کسی کے گھر کھانے پر جائیں تو کتنا پہلے پہنچنا مستحسن ہے اور کتنا بعد میں بیٹھنا۔ غلاموں، نوکروں کو کن اوقات میں گھر کے اندر آنا چاہیے اور کب نہیں، وضو کرتے وقت جسم کے کون سے حصے کہاں تک اور کتنی مرتبہ گیلے کرنے ضروری ہیں، عورت کے لباس اور محرم نامحرم کی تفصیلات، مرد کے نکاح میں آنے والی عورتوں کی تفصیل، جائیداد کی تقسیم، جرائم کے گواہان کی تعداد اور شرائط۔ غرضیکہ تمدن سے متعلق تقریباً ہر مسئلے پر قرآن اور اسوۂ حسنہ میں فیصلے موجود

تھے، لیکن مملکت کے معاملات اور مردوں کے ظاہری حلیہ پر قرآن کا کوئی فیصلہ موجود نہ تھا، صرف رسول اللہ ﷺ کی سربراہِ حکومت کے طور پر مثال موجود تھی، جیسے آپؐ کے بارے میں لوگوں کو علم تھا کہ آپؐ کے سر اور چہرے کے بال کیسے تھے یا آپؐ اپنے کپڑوں اور جوتوں کے پیوند اپنے ہاتھوں سے لگاتے تھے لیکن لوگوں کو کوئی مخصوص حلیہ اختیار کرنے کا یا اپنے کپڑوں اور جوتوں کی مرمت خود کرنے کا کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ چنانچہ ہمارے وہ پرخلوص دوست جنہوں نے داڑھی کو مسلمانوں کی شناخت کے طور پر پیش کیا ہے، کبھی اپنے کپڑوں اور جوتوں کی خود مرمت نہیں کرتے نہ ہی رسول اللہ کی کم خوری اور مالی حالت کی نقل کرتے ہیں۔ آپؐ کے ان اوصاف کو اسلام کی شناخت ماننے کی بجائے ایک ایسی شناخت پر زور دیا جا رہا ہے جو آپ کا امتیازی نشان نہ تھی۔ داڑھی وقت کا دستور تھا، جبکہ علم کی جستجو اور عجز وانکسار کے نئے انداز آپ ﷺ کے امتیازی نشان تھے، جو عربوں نے مشکل سے سیکھے مگر آسانی سے بھلا دیے۔

عام لوگ جانتے ہیں کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے فقہی مؤقف اور سید قطب کے نظریات کی پیروی کرنے والے حضرات مسلم عوام کو مسلسل یاد دلاتے رہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ انسانوں جیسے ایک انسان تھے اور اُن کا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچانا تھا، اور یہ کہ اصل صداقت قرآن ہے، اور حسبنا القرآن کا اصول یاد رکھنا چاہیے۔ اہلِحدیث کے اس موقف اور دوسرے مسلم عوام کے موقف میں کچھ فرق ہے، لیکن یہ ایسی بات نہیں جس پر تلخی پیدا ہو۔ فراخدلی اور باہم رواداری کے اصول اپنا کر شائستگی ممکن ہو جاتی ہے۔ لہٰذا فراخدلی سے افہام وتفہیم کے دروازے کھولنے چاہئیں۔ لیکن سب سے بہتر بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے عقائد کو دلائل کی زد سے بچانا چاہتا ہے تو انہیں ذاتی حیثیت تک رکھ لے اور اگر اپنے عقائد کو دوسروں پر نافذ کرنا چاہے تو دلائل اور بحث کا دروازہ فراخدلی سے کھول دے اور جبر کا رویہ اختیار نہ کرے۔ افہام وتفہیم کے لئے صرف ایسے موضوعات لئے جا سکتے ہیں جو انسانی عقل واستدلال سے حل ہوتے ہیں۔

یہاں اہم بات یہ ہے کہ القاعدہ طالبان اور تحریک اسلامی کی دوسری تنظیمیں جو اسلام کی مملکت کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں اور اس مقصد کے لئے کروڑوں مسلمانوں کو مسلح جہاد اور شہادت کے لئے اُکسا رہی ہیں، اُن کے بارے میں عام علم یہ ہے کہ یہ حضرات حضرت شاہ ولی اللہ اور شیخ محمد بن وہاب کے مسلک کی پیروی کرتے ہیں اور یہ دونوں بزرگ اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخری رُبع میں مدینہ کے کچھ ایسے اساتذہ سے فیض یاب ہوئے جو خلافت عثمانیہ کی بجائے حجاز کے عربوں کی خلافت بحال کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے ہندوستان میں مسلم اقتدار کی بحالی کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا، جبکہ شیخ عبدالوہاب نے سعودی مملکت کی بنیاد رکھی۔ جب کہ یہ طے تھا کہ اہلِ حجاز کے ہوتے ہوئے کسی اور ملک کے مسلمان عالمی مسلم برادری کے سربراہ نہیں ہو سکتے۔ اس ساری تحریک کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جہاں یہ مسلک قرآن کے احکام کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی بشریت پر زور دیتا ہے، وہاں اس بنیادی سوال کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے کہ اسلام میں مملکت کا تصور صرف رسول اللہ ﷺ کی ذاتی مثال کے سوا کہیں موجود نہیں۔ قرآن نے مملکت کے قیام کا نہ کوئی حکم دیا نہ نظامِ خلافت کے خدوخال اور اس کے اداروں کی کوئی نشاندہی کی۔ اور اسلامی مملکت کا صرف ایک ہی وجود مسلم اُمہ کے سامنے آیا جو کہ رسول اللہ ﷺ کی سربراہی میں قائم ہوئی، جس کا ہر فیصلہ رسولؐ نے کیا جبکہ آپؐ کی سربراہی کی بنیاد رسالت پر تھی یعنی آپ کی رہنمائی براہِ راست وحی سے ہوتی تھی۔ نہ صرف اہلحدیث اور دیوبند کے علما بلکہ مسلمانوں کے سبھی علما اس پر متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اس مملکت کو چلانے والوں کے تقرر اور اصولِ خلافت کے متعلق قرآن اور حدیث میں کوئی حکم موجود نہ تھا۔ صرف اہل تشیع کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا، مگر مسلم اُمہ کے باقی تمام مکاتب فکر کا عقیدہ یہ نہیں۔

کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ جس مسئلہ پر قرآن نے کوئی حکم نہیں دیا، اس پر اتنی شدت

سے مسلمانوں کو ابھارا جائے کہ کروڑوں مسلم عوام کی ممکنہ شہادتوں اور اذیتوں کو بھی جائز قرار دے دیا جائے، جبکہ اُمت مسلمہ میں فکری تقسیم اور فرقہ وارانہ رسہ کشی اس پر مستزاد ہے، جو بنیادی طور پر اسی فکری اختلاف سے پیدا ہوئی ہے۔ یعنی جہاں اُمت مسلمہ کی وسیع اکثریت اپنے دین کو محبت، سلامتی اور امن کا مذہب سمجھ کر تبلیغِ اسلام پر اکتفا کرتی ہے، وہاں تحریک خلافت کے نمائندہ مسلک کا اصرار ہے کہ اسلام کا بنیادی مقصد ہی جہاد وقتال کے ذریعے خلافت اسلامیہ کا قیام ہے اور چند دینی رہنماؤں کی مطلق العنان حکومت اسلام کی شناخت ہے۔

تحریک خلافت کے سرگرم کارکنوں اور اکثر و بیشتر رہنماؤں کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ نہایت پرخلوص اور راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ طالبان سے تمام اختلافات کے باوجود اُن کے جذبوں کی سچائی اور توانائی کا اعتراف سب کو ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ان لوگوں نے جہاں اپنے ان گنت معصوم ہم وطنوں کی زندگیاں جہنم بنائی ہیں اور دنیا بھر میں مسلم اُمہ کا امیج برباد کیا ہے، وہاں اِن کے اپنے دکھ اور قربانیاں بھی ان گنت ہیں۔ اگرچہ ان قربانیوں اور دکھوں کا سبب اُن کا وہ غلط طرزِ فکر ہے جس نے انہیں ایک بے ثمر محنت کے راستے پر ڈالا ہے۔

لیکن اِس غلط طرزِ فکر کے ابھرنے اور پھیلنے کی ذمہ داری مسلم اُمہ کے حکمرانوں، رہنماؤں اور دانشوروں پر بھی آتی ہے کہ جو مسلم اقوام کی تربیت کا کام کم علم لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ کر آسودگی اور اقتدار کا لطف اٹھاتے رہے۔ تقریباً ایک صدی کے عرصہ میں ہمارے اہل اقتدار اور نام نہاد دانشوروں نے دین کے معاملات کو توجہ ہی نہیں دی اور اگر دی تو جاگیردارانہ اور عسکری مفادات کی حفاظت کے لئے دی۔ دین کو مولوی اور مرشد کا شعبہ قرار دے کر یہ لوگ وقت کی نعمتوں سے مالا مال ہوتے رہے۔ اُدھر دنیا کی ترقی یافتہ اقوام مطمئن بلکہ مسرور تھیں کہ وسائل اور جذبوں سے مالا مال مسلم اقوام وقت کے پھل دار نظریات سے دور اپنے دین کے ہوائی قلعے تعمیر کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ بالآخر یہ جذباتی اور بے علم مسلم اقوام اِن ترقی یافتہ اقوام کے

مقاصد کا ایندھن بن گئیں۔ کمیونزم کی ظاہری شکست میں ہمارے "معصوم" جذبوں کا بڑا ہاتھ تھا، اس لئے ہم فخر کا غبارہ بن گئے۔ ڈر ہے کہ جب فخر کا یہ غبارہ پھٹے گا تو کہیں خود ہمارا ہی جسم چیتھڑے بن کے نہ اُڑ جائے۔ لہٰذا اس سوال پر مفصل بحث کی ضرورت ہے کہ کیا اسلامی مملکت کے قیام اور سارے عالم پر غلبہ اسلام کا نصب العین برحق ہے؟

اِس سلسلہ میں پہلا اور اہم ترین سوال تو اصولی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے، یعنی کیا اسلام نے کوئی مخصوص نظامِ حکومت تجویز کیا ہے؟ کیا یہ سوال بیہودہ اور مہمل ہے کہ قرآن و حدیث نے مسلمانوں کے لئے کوئی نظامِ حکومت کیوں تجویز نہیں کیا؟ اگر رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد صرف پچیس برس کا دور اسلامی حکمرانی کا دور تھا تو پھر بعد کے گیارہ سو سال جو دنیا میں مسلمانوں کی سلطنتوں کا دور ہے اور جس پر ہم مسلسل فخر کرتے ہیں کہ ہم دنیا کے حکمران تھے، کس زُمرے میں آتا ہے؟ کیا یہ رنگ برنگ بادشاہتیں مسلم اقوام کی گمراہی کا نشان تھیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں پر اللہ کا فضل صرف پچیس برس رہا؟

اور اگر یہ بادشاہتیں برحق تھیں اور اللہ کی منشا کے مطابق تھیں یعنی اولی الامر منکم کی تعریف پر پوری اترتی تھیں تو پھر آج کے مسلمانوں کی اچھی بری منتخب جمہوری حکومتوں پر کیا اعتراض ہے جو بادشاہتوں کی طرح مطلق العنان بھی نہیں؟ کیا مسلمانوں کی منتخب حکومتوں کو خاک میں ملا دینا صرف اس لئے جائز ہے کیونکہ وہ غیر مسلموں کی مملکتوں کے ساتھ جنگ نہیں کرتیں یا اُن سے دوستی کے تعلقات رکھتی ہیں؟ کیا اسلام ایسی مملکتوں کے خلاف اعلانِ جنگ کا حکم دیتا ہے جو نہ تو مسلمانوں پر اُن کے دین کی وجہ سے حملہ آور ہوتی ہوں نہ ہی اپنے ہاں مسلمانوں پر کوئی دینی پابندی عائد کرتی ہوں؟ کیا مسلم حکومتوں کا مقدر صرف یہ ہے کہ یا تو وہ دنیا سے جنگ کر کے تباہ ہوتی جائیں یا پھر اگر دنیا سے صلح کریں تو اپنے مجاہدین کے ہاتھوں تباہ ہو جائیں؟

دوسرا سوال عملی معاملات سے متعلق ہے۔ کیا آج کے دور کی صنعتی مملکتوں کو فتح

کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ ساتویں صدی عیسوی میں ایران کو فتح کرنا تھا؟ کیا مسلم افغانستان اور اسلامی جمہوریہ پاکستان مل کر سعودی عرب کی پشت پناہی سے روس، چین اور امریکہ کی موجودہ مملکتوں کو فتح کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ کیا ان دو کم نصیب ملکوں یعنی پاکستان اور افغانستان کے عوام کا مقدر یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ اپنے کھانے کے لئے غلہ اور سبزیاں پوری نہ کر سکیں، آج کے دور کی ننھی منھی سہولتیں مثلاً بجلی پانی کے لئے ترسیں، تو دوسری طرف مہلک ترین ہتھیاروں سے لیس اور زبردست معاشی قوت کی مالک اقوام سے جنگ کر کے کروڑوں کی تعداد میں ''شہید'' ہو جائیں؟ کیا اِن اقوام کے لئے اس دنیا کی ساری محرومیوں سے آزاد ہونے کا صرف یہی ایک راستہ بچا ہے؟

تیسرا سوال بھی شائد اتنا ہی اہم ہے۔ خلافتِ راشدہ تقریباً پچیس سال قائم رہی، پھر ''دانتوں سے کاٹنے والی بادشاہت'' نے مسلم معاشروں پر ہزار سال سے زیادہ عرصہ حکومت کی، جسے کوئی بھی بنیاد پرست عالم ''صالح'' حکومتیں تسلیم نہیں کرتا۔ اب تین سو سال سے مسلم اقوام اپنے تمام تر وسائل اور جذبوں کے باوجود غیر مسلم اقوام کی محتاج اور کاسہ لیس ہیں۔ کیا اِس بات کی کوئی ضمانت موجود ہے کہ اگر کروڑوں شہادتوں کے بعد ہم سارے مسلمان قربانیاں دے کر عربوں کی مقدس عالمی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ عالمی مملکت پچیس سال سے زیادہ عرصہ قائم رہے گی؟ کیا ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ اِن پچیس برسوں کے لئے مسلمانوں کی سربراہی کرنے والے محترم بزرگ ہمارے درمیان موجود ہیں؟ وہ کون ہیں اور کہاں ہیں؟ کیا ہم مسلم اُمہ کو ان کے ناموں سے آگاہ کر سکتے ہیں جو (نعوذ باللہ) رسول اللہ ﷺ کی تربیت یافتہ نسل سے بھی بڑھ کر پارسا اور صاحبِ علم ہیں؟ اور کروڑوں شہادتوں کی پیٹھ پر قائم ہونے والی یہ صالح حکومت جب درہم برہم ہو گی تو پھر کون سا نظام رائج ہو گا؟ کیا پھر ''دانتوں سے کاٹنے والی بادشاہت''؟

آخری سوال یہ ہے کہ کروڑوں انسانوں کو قتل اور کروڑوں کو شہید کرنے کے بعد ہم

جو نظام قائم کریں گے وہ باقی بچی ہوئی تباہ حال دنیا کو کیا سکھ دے گا؟ کیا ہم نے اِس نظام کا کوئی نمونہ دنیا کو دکھایا ہے؟ کیا افغانستان میں پانچ چھ برس تک حکومت کرنے والا ہمارا طالبانی نظام وہ مثالی نظام ہے جس کا انتظار بنی نوع انسان صدیوں سے کر رہے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آخر کیوں دنیا کی پڑوسی اقوام نے اِس نظام کو خوش آمدید نہیں کہا جبکہ ہم جانتے ہیں کہ نظام اگر دکھی انسانیت کو سکھ کی اُمید دیتا ہے تو لوگ اُس کی طرف لپکتے ہیں، آخر کیوں ایسا ہے کہ اِرد گرد کی آبادیاں طالبان کا نام سن کر دہشت زدہ ہو جاتی تھیں؟ اگر نظام کا مقصد انسانی زندگی کو آسودگی اور شرف دینا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ آسودگی اور شرف دینے والا کوئی نظام لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی بجائے اُن کے لئے دہشت کا باعث بن جائے؟ اور اگر اچھے نظام کا مقصد آسودگی اور وسعت دینے کی بجائے اذیت اور تنگی دینا ہے تو پھر لوگوں کو ایسے نظام کے خلاف بغاوت سے کیسے روکا جائے گا؟

ہم دیکھتے ہیں کہ ساری دنیا کے انسان جن میں مسلم عوام بھی شامل ہیں، صنعتی معاشروں کی پیدا کردہ آسودگی اور وسعت کی طرف کھچے چلے جا رہے ہیں۔ یعنی اقتدار میں عوام کی شمولیت جسے جمہوریت کہتے ہیں اور انسانی حقوق اور انسانی زندگی کو آسان بنانے والی ایجادات ایسی مقناطیسی قوت ہے جو سارے انسانوں کا دل و دماغ جیت رہی ہے۔

مثلاً اگر طالبان کی اسلامی امارات میں یہ عام اعلان کر دیا جاتا یا آج دنیا کے ممالک میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ جو کوئی بھی امریکہ یا یورپ کا شہری بننا چاہے، آ جائے، تو کتنے لوگ ایسے ہوں گے جو جانے کے لئے بے قرار ہوں گے؟ دوسری طرف اگر دنیا کے تمام ممالک میں اعلان کر دیا جائے کہ جو کوئی بھی طالبان کے اسلامی امارات میں شہریت چاہے وہ آ سکتا ہے تو دنیا بھر سے، حتیٰ کہ پاکستان سے کتنے لوگ جانا چاہیں گے؟

کیا ہم شیخوں اور دینی عالموں کی مطلق العنان حکومت کے لئے دنیا کو اطاعت پر آمادہ کر سکتے ہیں؟

پارسائی کا مبالغہ

یہ شائد ہماری نرگسیت یا مریضانہ خود پسندی کی ایک علامت ہے کہ ہم کریڈٹ اپنے لئے رکھ کر ملامت دوسروں پر ڈال دیتے ہیں۔ مسلم معاشروں اور، خصوصی طور پر پاکستان کی الجھنوں کا ایک سبب شائد یہ ہے کہ اِن کے بلند آواز عناصر کی خود اعتمادی انہیں اپنی آواز کے سوا کچھ سننے ہی نہیں دیتی۔ کہنے کو تو ہمارے ہاں روحانیت کے چرچے ہیں لیکن فضیلت کی بنیاد مال اور اقتدار کے سوا کچھ نہیں۔ نہ علم و دانش کی کوئی وقعت ہے نہ خدمت و خلوص کی، نہ محنت و استقامت کسی کھاتے میں ہیں، نہ ہنر اور لگن، نہ ہی سادگی اور انکسار قابل احترام بن سکے ہیں۔

زیادہ غور سے دیکھنا ہمارے ہاں ناپسندیدہ عمل ہے، ہم گزرتی ہوئی عورتوں کے علاوہ کسی بھی حقیقت کو زیادہ توجہ سے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ تاہم اگر کچھ وقت کے لئے اِس قانون کو بدل دیا جائے اور غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہماری نظر میں مال اور اقتدار بھی اُسی صورت میں باعث فضیلت ہے اگر وہ ہمارا اپنا ہے یا ہمارے پسندیدہ لوگوں کا ہے۔ حتیٰ کہ عبادت بھی وہی ٹھیک ہے جو ہمارے پسندیدہ مسلک کے مطابق کی جائے۔

سنتِ رسولؐ کے کچھ ظاہری پہلوؤں کو دنیاوی جاہ و جلال کا ایسا ذریعہ بنا لیا گیا ہے کہ نبیؐ کے سارے باطنی کمالات آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے آپؐ کی ذات میں شفقت و انکسار، محبت، درگزر، شیریں کلامی، فراخدلی، تنگدستی میں وقار اور حسِ جمال

ایسی خوبیاں تھیں جو صرف نعتوں اور خطبوں کا مضمون ہیں۔ اقبال نے اپنے پہلے لیکچر میں رسول اللہ ﷺ کی ایک دعا کا ذکر کیا تھا کہ "اے اللہ مجھے واقعات و کائنات کی اصل صداقتوں کا علم عطا کر"۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے علم کی یہ آرزو اب ہمارے لئے قابل تقلید نہیں رہی۔ قابل تقلید ہے تو بس ایک مخصوص حُلیہ، جسے دیکھ کر دل نہیں مانتا کہ عربوں کے نفیس ترین صاحب جمالؐ کی مشابہت اِن لوگوں سے ہو سکتی ہے جن کے کاروبار حرص کے جہنم اور گھر خوشحالی کے نمائش کدے ہیں، جن کے وعظ کڑکتی بجلیوں جیسے اور چہرے کرختگی کے صحرا ہیں، جہاں اپنائیت سے بھری ایک مسکراہٹ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آپ کی آنکھیں بھر آئیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے دولت اور خوشحالی سے منع نہیں کیا بلکہ اِس دنیا میں جو اچھا ہے سب حلال ہے۔ تو کیا کرخت حُلیے، اپنائیت سے خالی چہرے اور جستجو سے محروم آنکھیں یہی "**حسنہ**" کی تعریف میں آتی ہیں؟

اس نرگسی تمدن کی تہہ میں بہت سی خوش فہمیاں اور غلط فہمیاں ہیں، مبالغے اور مغالطے ہیں، جن کے نتیجے میں یہ تمدن ایک ایسی اذیت میں پھنس گیا ہے جو ہر دن بڑھتی ہے لیکن دردمندی اور احساس کی بجائے الٹا کرختگی کو جنم دیتی ہے۔ بے حسی اور خود پسندی کی وہ شکلیں جو ہمیں اپنے اِس معاشرے کے طاقتور اور خوشحال طبقوں میں ملتی ہیں غالباً دنیا کے بدترین سرمایہ پرست معاشروں کے مافیا کے ہاں بھی نہیں۔ یورپ اور امریکہ، روس اور چین جنہیں ہم مادیت پرستی کے طعنے دیتے نہیں تھکتے، وہاں کے بدترین سرمایہ پرست اگر ہمارے تاجر، عالم دین اور مجاہد کی سنگ دلی دیکھ لیں تو شدتِ رشک سے پتھر ہو جائیں۔

حقیقی اذیت کا شکار معاشرہ کے وہ کم نصیب طبقے ہیں جو اکثریت میں ہیں، لیکن احتجاج کی شدت ایسے خوش نصیبوں کے ہاں ملتی ہے جنہیں بظاہر کوئی تکلیف نہیں۔ دل ہلا دینے والی چیخیں ایسے حلقوں سے سنائی دے رہی ہیں جو دین کی نگرانی کے دعویدار ہیں، یا جن کا تعلق نفاذ دین کی تحریکوں سے ہے جنہیں ایک تو خود مسائل کا سامنا نہیں دوسرے عوام کے

مسائل کبھی ان کا مسئلہ نہیں رہے۔ پاکستان کی صنعت و حرفت پر مسلسل زوال ہے، جبکہ غیر پیداواری تجارت، کرپشن اور غیر ملکی امداد کچھ لوگوں کی خوشحالی کے واحد ذرائع رہ گئے ہیں، ہم فخر سے کہتے ہیں کہ ہم امریکہ کی مجبوری بن گئے ہیں لہٰذا وہ اور دے گا۔

فوجی آمریتوں کے ساتھ دینی قوتوں اور مسلمان کاروباری طبقوں کا کچھ ایسا فطری اتحاد ہے کہ آمریتوں کے دس دس برس ایک مست سناٹا چھایا رہتا ہے، جبکہ سول حکمرانی آتے ہی چیخ و پکار آسمان تک جاتی ہے، میڈیا ایک ایک دن کا حساب مانگتا ہے، دین کی حفاظت پر مامور جماعتیں اذیت میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور خوشحال کاروباری عناصر کو زندگی جہنم دکھائی دیتی ہے۔ اِس نفرت کا نتیجہ ہے کہ محترم نواز شریف جو خوشحال کاروباری طبقوں کے محبوب قائد مشہور تھے، ان طبقوں میں صرف اس لئے ناقابل برداشت ہو گئے کہ انہوں نے فوج کو دعوت دینے کی بجائے سول حکومت سے تعاون کر لیا۔

سول حکمرانی اور جمہوریت کا یہ دعویٰ نہیں کہ یہ مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ نظام اس لئے بہتر ہے کیونکہ یہ رضامندی اور شمولیت کا نظام ہے۔ انسانی عقل اور علم کو جائز مانتا ہے۔ اجتماعی عقل اور شراکت اقتدار کو برحق قرار دیتا ہے۔ کسی یونیورسٹی یا کسی مدرسہ کی سند کو عوام پر حکمرانی کا پروانہ نہیں مانتا۔ یہ نظام کسی جرنیل یا جج کا یہ حق نہیں مانتا کہ وہ عوام کی تنخواہ وصول کرتے کرتے ان پر حکمران بن کر مسلط ہو جائے اور پھر اسے ہٹانے کا کوئی راستہ ہی نہ ہو۔ یہ لوگوں کو اپنے حکمران چننے کا بار بار موقع فراہم کرنے کا نظام ہے جو ایسے لوگوں کو زہر لگتا ہے جنہیں لوگ زہر لگتے ہیں اور لوگوں کی شمولیت عذاب۔

وہ عناصر جن کے دانت اس ملک کی شہ رگ میں پیوست ہیں، جن کی پیاس مٹاتے مٹاتے یہ ملک سوکھی ریت کا صحرا بن گیا ہے، جنھوں نے پاکستان کی 63 سالہ تاریخ میں 50 سال سے زیادہ حکومت کی ہے، جب یہ جمہوریت پر خون کے پیاسے ہو کر جھپٹتے ہیں تو سوچنا پڑتا ہے کہ اس صورتحال کے پیچھے کیا ہے؟ اگر جمہوریت سے شدید نفرت کرنے والوں

نے اس ملک کو سنوارا ہوتا اور جمہوری ادوار میں تباہی و بربادی کے واضح ثبوت سامنے ہوتے تو پھر بات کافی واضح ہو جاتی۔ پھر بھی یہ سوال باقی رہ جاتا کہ آخر وہ کیا قوت ہے جو اتنے کرپٹ سیاسی لوگوں کو ملک پر پھر مسلط ہونے میں مدد دیتی ہے۔ مثلاً 1977ء میں ضیاء الحق اور اس کی ٹیم نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹ کر دنیا کو خوشخبری دی کہ بھٹو کی آمریت ختم کر دی گئی ہے، بدی کے اس مرکز کو تباہ کر دیا گیا ہے، اب دھاندلی سے جیتنے والے بھٹو کی جماعت کو کھلے انتخابات میں شکست ہوگی۔ لیکن انتخابات کبھی منعقد نہ ہو سکے کیونکہ ایجنسیوں اور ضیاء پرستوں کی رپورٹ کے مطابق پیپلز پارٹی کو شکست دینا ممکن نہ تھا۔ پھر فوجی آمریت نے بھٹو صاحب کو جسمانی طور پر ختم کر کے دس برس کی مسلسل مہم کے بعد جب انتخابات کروائے تو لٹی اور ماری ہوئی پیپلز پارٹی نے آمریت کے دودھ پر پلے ہوئے پہلوانوں کو شکست دے دی۔ بدنامی کے طوفان سے نڈھال ہونے کے باوجود اور طویل جلاوطنی کاٹنے کے بعد سیاسی رہنما ہی عوام کے رہنما رہے۔ چنانچہ شریف برادران اور محترمہ بے نظیر کو لوگوں نے پھر حکومت کرنے کے لیے منتخب کیا۔ لہٰذا اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ جمہوریت نے اس ملک کو لوٹ کھایا ہے اور فوجی آمریتوں اور ان کے لے پالک اداکاروں نے ملک کو چار چاند لگا دیئے ہیں، تب بھی لوگوں کا بار بار جمہوری پارٹیوں کو عزت دینا ایک سوال رہ جاتا ہے۔ اسی طرح دس سالہ جبری جلاوطنی کے بعد میاں نواز شریف کو عوام کی طرف سے پذیرائی اس کی عمدہ مثال تھی۔

جبکہ سچ یہ ہے کہ اس ملک کا جو حال ہوا ہے اس کی ذمہ داری مکمل طور پر ان عناصر کی گردن پر ہے جو ہر بار سول حکمرانی اور جمہوری عمل پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جو بھی اچھی بری ترقی ہوئی ہے اس کا سہرا جمہوری عمل اور جمہوری قوتوں کے سر ہے، جن میں اُس دور کی نواز لیگ شامل ہے جب وہ آمریت کے سائے سے نکل کر خود آمریت کا نشانہ بنی اور اے این پی شامل ہے جو بھٹو صاحب کی طرف سے زیادتی کے باوجود بالآخر جمہوری عمل میں پیپلز پارٹی کی رفیق ہے اور ایم کیو ایم شامل ہے جو الزامات سے قطع نظر کراچی کے لاکھوں

پڑھے لکھے مڈل کلاس عوام کی آواز ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بھٹو صاحب نے صنعتوں کو تباہ کر دیا اور پاکستان کو ایشیا کا ٹائیگر بننے سے روک دیا۔ اگر یہ سچ ہے کہ بھٹو صاحب کے صرف تین برس (یعنی 1974 تا 1977) کے اقدام نے صنعتوں کو ڈھیر کر دیا، یعنی چند صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے اور محنت کش ملازمین کو ''گستاخ'' بنانے کے عمل نے ایسا کیا، تو پھر کیا وجہ ہے کہ بھٹو کے بدترین دشمنوں اور مخالفوں کی حکومتیں جو 1977ء سے 2008ء تک 30 برس قوم کی پیٹھ پر سوار رہی ہیں، صنعتوں کو بحال اور توانا نہیں کر سکیں۔ سوویت یونین میں 1917ء سے 1987ء تک ستر برس قومی ملکیت اور مزدور کی گستاخی کا دور دورہ رہا۔ قومی ملکیت اور مزدور کی آزادی سے اگر تباہی آتی ہے تو ستر برس یہ تباہی ہوتی رہی۔ حالانکہ یہ ملک سوئی سے لے کر سپٹنک تک بنانے لگ گیا، تاہم مانا کہ مزدور کی آمریت نے جمود پیدا کیا۔ پھر کیا سبب ہے کہ 1987 سے 2007ء کے بیس برس میں روس دنیا کے مضبوط ترین صنعتی ملکوں میں پلٹ آیا۔ اور اب زرمبادلہ کے ذخائر اور صنعتی خوشحالی میں دنیا کے پہلے چار پانچ ملکوں میں سے ہے۔ اسی طرح چین کی مثال ہے جو 1949ء سے قومی ملکیت اور مزدوروں کی گستاخی کا علمبردار ہے۔ پھر کیونکر ایسا ہوا کہ یہ دنیا کی مضبوط ترین صنعتی معیشت کے طور پر ابھرا ہے۔

سچ یہ ہے کہ ہماری صنعتوں کے زوال کا تعلق بھٹو کے تین برس کے ساتھ نہیں۔ کڑوا سچ یہ ہے کہ ہمارے ہاں گملوں میں اُگی ہوئی ایک ایسی کرپٹ سرمایہ داری مسلط ہے جسے خون کا پیدائشی سرطان ہے۔ اسے ہر سال عالمی امداد اور سرکاری سرپرستی کی ضرورت پڑتی ہے جو کہ اس لئے دستیاب نہیں ہو پاتی کیونکہ یہ ملک فکری اور اصولی طور پر جدید صنعتی اور جمہوری ترقی کے لئے بنا ہی نہیں۔ اس کی صنعت اور سیاست کی جڑوں میں کوئی فلسفہ ایک وسیع و عریض چٹان کی طرح پڑا ہے جو جڑوں کو پھیلنے ہی نہیں دیتا۔ جمہوریت اور صنعت دونوں جدید علوم کی پیداوار ہیں۔ ممکن نہیں کہ یہ قبائلی افکار سے بندھے ہوئے معاشروں میں پروان

چڑھیں۔ جمہوریت کو اختلاف، شمولیت اور فراخدلی کی ضرورت ہوتی ہے جو کھلے فکر کے ماحول میں میسر آتی ہے اور صنعت کا اصول ہے کہ یہ ریسرچ یعنی جستجو اور ایجاد پر پلتی ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں یہ کیسے پنپ سکتی ہیں جہاں صنعتکار سمیت ہر کسی کا نصب العین صرف بے حد منافع اور بے حد ثواب ہو، جہاں مملکت شب و روز مسلح افواج کی خوشامد اور اندر باہر کے دشمنوں سے اپنا دفاع کرنے میں لگی ہو۔ یعنی وسائل کا عظیم ترین حصہ افواج اور عسکری مقاصد پر خرچ ہوتا ہو، فوجی قوت صنعت کے نتیجے میں پیدا ہونے کی بجائے صنعت فوجی قوت کی محتاج ہو، لوگ ریسرچ کے نام سے الرجک ہوں، کتاب صرف امتحان پاس کرنے کے لئے پڑھی جاتی ہو، قوم کی درسگاہیں اور مدرسے قاری، حافظ اور مفتی پیدا کریں اور قوم کے خوشحال طبقوں کے ہاں استدلال اور علم کا داخلہ بند ہو۔

حفاظ پیدا کرنے والے اس معاشرے میں بورڈ اور یونیورسٹی کے نتائج میں حاصل کردہ نمبر بڑھتے بڑھتے اب سو فیصد کو آ پہنچے ہیں۔ جیسے کہ بچوں کا حافظہ کمپیوٹر سے بھی بڑھ گیا ہے لیکن سو فیصد مارکس لینے والی یہ نسلیں علم کا انڈہ کہاں دیتی ہیں، کسی کو نہ خبر ہے نہ پرواہ۔ حافظ، قاری اور امام مسجد پیدا کرنے کا مشن قوم کو یوں تو پاکستان بننے کے ساتھ ہی عطا ہو گیا تھا لیکن ایوب خان کے دور میں کچھ رکاوٹ رہی۔ قوم دوسرے علوم کے عالم بھی پیدا کرتی تھی۔ چنانچہ بھٹو صاحب کی تحریک کو ان گنت دانشور، فنکار، شاعر اور انجینئر ملے، جو روشن خیال ہونے کو گالی نہیں مانتے تھے۔ پھر ضیاء الحق اور افغان جنگ نے قوم کے مقاصد و معیار بدل دیئے۔ مال اور مذہب فضیلت کا میعار بن گئے۔ حتیٰ کہ محترمہ بینظیر کے آتے آتے پارٹی کے پرانے ساتھی بھٹو صاحب کی شہادت کے باعث بددل ہو کر یا عافیت کی بُکل مار کر غائب ہو چکے تھے جبکہ نئے دانشوروں کی دانشگاہیں سعودی عرب منتقل ہو چکی تھیں۔ پیپلز پارٹی کے پاس جو بچا تھا وہ ثابت قدم مگر بے علم کارکنوں کا ایسا ہجوم تھا جو جمہوریت اور بھٹو خاندان کے لیے جان تو دے سکتے تھے لیکن اپنے قائدین اور عوام کو راستہ دکھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے

تھے۔

فکری وفاداریوں کا سعودی عرب منتقل ہونا اچھا تھا یا برا اس کا فیصلہ دو طرح سے ممکن ہے۔ ایک ایمان اور عقیدہ کے تناظر میں اور دوسرے، نتائج کے اعتبار سے۔ یہ الگ بات کہ عقائد کا تناظر ایسا ہے کہ اس میں نتائج خواہ کتنے بھیانک ہوں نور میں دھلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اگر کسی پہلو کی بدصورتی ٹالے نہ ٹلے تو اسے شیطان کے کھاتے میں ڈالنا یا روشن خیالی کے سر منڈھ دینا مشکل نہیں ہوتا۔ چنانچہ میڈیا اور رائے زنی کے کئی سورما اس وقت اسی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ تاہم نتائج خودکشی کا بارود بن کر سب کے سامنے پھٹ رہے ہیں۔

کیا پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ یہاں اسلام اور جرنیل اور جج اور میڈیا مظلوم ہیں، اسلام کے محافظ کمزور ہیں اور مذہبی سیاست کرنے والوں کی کوئی آواز نہیں؟ یا کیا اس کا المیہ اس کے عین برعکس ہے کہ یہ ملک اکیسویں صدی میں قبائلی نظام کے محافظوں کا یرغمال بنا ہوا ہے؟ کیا پاکستانی معاشرہ کی بدترین الجھنوں کا علاج یہ ہے کہ اسے اسلام اور اس کو استعمال کرنے والوں سے بھر دیا جائے یا جمہوریت اور مذہبی فراخدلی پر مبنی جدید طرزِ حکومت اس کے معاملات کا حل ہے؟

جمہوریت اور انسانی وسائل کی نشوونما کیوں ضروری ہے، یہ پہلا سوال ہے۔ اگرچہ یہ سوال مسلم ممالک کے سوا دنیا کے کسی ملک میں اب زیر بحث نہیں۔ جمہوریت اور جدید علمی بنیادوں پر انسانی وسائل کی نشوونما ایسی بنیادی ضرورتیں ہیں جس پر کسی کو اختلاف نہیں۔ اگرچہ امریکہ کی حکومت چین پر اعتراض کرتی ہے کہ وہاں عوام کو جمہوری حقوق حاصل نہیں لیکن چین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اُس کے ہاں جمہوریت اپنی حقیقی وسیع ترین شکل میں موجود ہے جس کا نتیجہ اس کے عوام کی بڑھتی ہوئی شمولیت اور خوشحالی ہے۔ تاہم ہمارے ہاں جمہوریت کا سوال ابھی تک بحث کا موضوع ہے۔

پچھلی ایک صدی میں آبادیوں کا پھیلاؤ اور انسانی امنگوں کا ابھار ایک نئے انداز سے ہوا ہے۔ بہتر علاج اور زندگی کی بڑھتی ہوئی سہولتوں کے ساتھ شعور پھیلا ہے۔ رسل و رسائل اور معلومات کا سیلاب آ گیا ہے، جس نے عام لوگوں کو آرزو کرنے اور حاصل کرنے کی سوچ دی ہے۔ ہمارے ہاں بجلی اور توانائی کے جدید نظام میں آنے والی کوتاہیوں پر عوام کا شدید ردعمل یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ انسان پچھلی صدیوں کے طرزِ زندگی کو قبول نہیں کرتا، اسے جدید ترین سہولتیں مانگنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ ایک بجلی اور توانائی ہی کی بات نہیں، علاج معالجہ، رہائش، لباس، تعلیم، تفریح اور نقل و حمل کے ذرائع سبھی جدید بنیادوں پر فراہم کرنا آج کی مملکتوں پر لازم ہو گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ مسلم معاشرے جمہوری نظام اور مذہبی برابری کے لئے اصرار نہیں کرتے، کیونکہ مذہبی نظریات اور جاگیردارانہ قبائلی نظام کے علاوہ جرنیلوں کا عمل دخل ایسا ہے کہ فکری سطح پر بہت الجھنیں موجود ہیں۔ مسائل پر بات کرنے کی مکمل آزادی نہیں۔ مذہبی قوتیں جارحانہ اثر و رسوخ کا استعمال کر کے مسائل کی بحث کو بے نتیجہ بناتی رہی ہیں، حتیٰ کہ اُن کی قوت بالآخر مملکت سے بغاوت کی شکل اختیار کر گئی ہے۔

لیکن عالمی معاشرہ مسلم معاشروں کے لئے رک نہیں سکتا۔ صنعت اور پیداوار کے جدید نظام تیزی سے اور بھی جدید ہوتے جا رہے ہیں۔ آگے کی طرف تبدیلی بقا کی لازمی شرط ہے۔ بہت سے ملک علم کی معیشت کے دور میں داخل ہو گئے ہیں یعنی صنعت و حرفت اور زراعت ہی نہیں بلکہ تقریباً ہر شعبۂ زندگی میں جدید ترین سائنسی علوم اور کمپیوٹر اور مصنوعی ذہانت کے آلات کی مدد لی جانے لگی ہے۔ ایسے حالات میں پسماندہ معاشی نظام زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ پیداوار کے بوسیدہ نظام کے ساتھ پاکستان اپنی ادائیگیوں کا توازن مزید تباہ ہونے سے روک نہیں سکتا۔ نہ ہی انتظامی اور دفاعی لحاظ سے اپنی سلامتی کو یقینی بنا سکتا ہے۔ جسے بیرونی جارحیت سے زیادہ اندرونی خطروں یعنی جرائم پیشہ گروہوں اور باقی عناصر کا سامنا ہے۔ جب ہمارے دینی رہنما خودمختاری اور غیرت کا نام لیتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ

پاکستان دنیا کے ممالک کے آگے کشکول پھیلانا بند کر دے تو وہ اس بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے کہ یہ ملک صنعت اور جدید علوم کے بغیر خود کفالت کا خواب کیسے دیکھ سکتا ہے اور صنعت ریسرچ کے بغیر کیسے پنپ سکتی ہے۔ یا یہ کہ ریسرچ انسانی وسائل کی نشوونما کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ اور انسانی وسائل کی نشوونما افکار کی آزادی کے بغیر کیسے ممکن ہے؟

انسانی وسائل کی پسماندگی کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کے کسی شعبہ میں کوئی منصوبہ بندی ایسی نہیں جو ملکی آبادی کے معاملات حل کر سکے، معدنی وسائل کی تنظیم، رسل و رسائل، نقل و حمل، صحت، تعلیم، زراعت اور صنعت میں سے کون سا شعبہ ہے جہاں ہماری کارکردگی ہمارے مسائل کے مطابق ہے؟ عالمی معیار کی تو بحث ہی کیا ہم پچھلے کئی عشروں سے اپنے پرانے معیار بھی برقرار نہیں رکھ سکے۔

Jurat-e-Tehqiq

آزاد میڈیا کا مبالغہ

انفارمیشن میڈیا جس میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا دونوں شامل ہیں، بنیادی طور پر جدید صنعتی دور کی پیداوار ہیں۔ یہ ابتدا میں اطلاع رسانی کے لئے ایجاد ہوئے لیکن پھر رائے سازی بھی ان کے فرائض میں شامل ہوگئی۔ رائے سازی اور فکری تربیت کا کام ہزاروں برس پرانا ہے۔ یہ تہذیب کی نشوونما کے ساتھ نمو پذیر رہا ہے۔ شروع میں مذاہب نے عقائد کے ذریعے معاشروں کی فکری تربیت اور رائے کی تعمیر کی، جس میں انسانی فکر اور جستجو کا عمل بہت محدود تھا۔ چنانچہ مفکر اور فلسفی کا دائرہ کار مذہب کی تشریح و تبلیغ تک محدود رہا۔ جب جدید صنعتی دور کے علوم پیدا ہوئے تو سوچنے والوں نے پہلی بار علم کو نتائج کے ساتھ مربوط کرنا شروع کیا۔ یعنی انسانی فکر اور منطق کا دخل شروع ہوا۔ آج یہ اصول طے شدہ ہے کہ علم صرف وہ ہے جو آزمائے جانے کے لئے تیار ہو یعنی ٹیسٹ قبول کرے۔ یعنی علم اور نظریہ کے لئے ضروری ہے کہ انسان اور دنیا کے لئے کارآمد ہو یا بار بار آزمائش سے گزر کر صحیح ثابت ہو، جس کا دعویٰ کرے اس عمل میں درست ثابت ہو یعنی دعوے کے مطابق نتائج دے۔ یوں علم عقیدے سے الگ ایک خود مختار شعبہ بن گیا ہے۔ لیکن یہ عمل جو دنیا بھر میں نمو پذیر ہے، ہمارے مسلم معاشروں میں شروع ہی نہیں ہوا یا بے حد محدود ہے۔

علم اور عقیدہ میں جن معاملات پر نمایاں فرق ہے اُن میں ایک تو یہ ہے کہ عقیدہ کو کسی ٹیسٹ کے ذریعے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جبکہ علم اس کا پابند ہوتا ہے۔ دوسرا

اہم فرق یہ ہے کہ عقیدہ احساس فضیلت اور فخر کو پیدا کرتا ہے جبکہ علم انکسار کے بغیر ممکن نہیں۔ علم شک کا پہلو نظر انداز نہیں کرتا، ہر لمحہ غلط ثابت ہونے پر تیار رہتا ہے۔ لہٰذا فضیلت کی بجائے ضبط اور فراخدلی، شمولیت اور گنجائش کا اصول اس کی پہلی شرط ہے۔

اگرچہ میڈیا کا سب سے اہم رول خبر پہنچانا ہے تاہم یہ رول اس پر ختم نہیں ہوتا بلکہ رائے اور افکار کی تعمیر بھی اس کے فرائض میں آتے ہیں۔ وقت کے اعلیٰ ترین علم اور خبر سے واقفیت اور اس کا احترام ایک اچھے میڈیا کی پہلی اور اہم ترین صفت ہے جس کے لئے میڈیا کے سرکردہ افراد آپس میں تبادلۂ خیال اور دستیاب علوم سے استفادہ کرتے ہیں۔ خود خبر کی ترسیل میں ایسے پہلو موجود ہوتے ہیں، جن سے ایک خاص رائے پیدا کی جاسکتی ہے۔ جدید افکار کی ٹیکنالوجی نے خبر کی لطیف پہلوگری کے کئی ڈھنگ ایجاد کئے ہیں، جو فنِ بلاغت کے قدیم طریقوں سے کافی مختلف ہیں۔ قدیم فن بلاغت کا انحصار عقائد اور دعوؤں پر تھا۔ چنانچہ اس میں تبلیغ یا مناظرہ کا رنگ غالب ہوتا تھا، یعنی احساس فضیلت اور فخر کا رنگ، جو اپنے نظریہ کی سچائی کا یقین ہونے سے آتا ہے۔ جب ابلاغ کے علمی اسلوب رائج ہوئے تو آہستہ آہستہ ''شائد'' کا پہلو نمایاں ہونے لگا، احساس فضیلت کی جگہ اس احساس نے لے لی کہ ہوسکتا ہے میرا نقطہ نظر غلط ہو۔ یوں پرچار اور للکار کی جگہ انکسار اور تجویز کا رنگ غالب ہوگیا، جو کہ خبر کی پہلوگری کے علاوہ رائے کے کھلے اظہار میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ جدید ابلاغ کے یہ ڈھنگ اور آرٹ چونکہ صرف ایک رائے کے حامی استعمال نہیں کرتے بلکہ مخالف فریق بھی ان سے واقف ہے اور استعمال کا حق رکھتا ہے، چنانچہ رسہ کشی اور منافرت سے بچنے کے لئے مہذب معاشروں نے میڈیا کی اخلاقیات مرتب کیں۔

میڈیا کی اخلاقیات کے لئے ایک مسلمہ اصول یہ ہے کہ یہ پیشہ ورانہ معیار کے مطابق ہو۔ پیشہ ورانہ سے مراد ہے ذاتی پسند ناپسند اور جذبات سے الگ ہوکر متعلقہ کام کو اس کے اپنے تقاضوں کے مطابق سرانجام دینا۔ مثلاً اگر آپ آٹو انجینئر ہیں، آپ کا ایک ناپسندیدہ

پڑوسی جس سے کل ہی آپ کی تلخی ہوئی ہے، اپنی کار کے کسی نقص کو دور کرانے آپ کی ورکشاپ میں آیا ہے، آپ اس کے نقص کو ٹھیک کرنے کی بجائے کچھ مزید پرزے خراب کردیتے ہیں یا تبدیل کر دیتے ہیں اور اسے دو گھنٹے کی بجائے دو ہفتے تک لٹکاتے ہیں، تو آپ کا یہ رویہ پیشہ ورانہ معیار سے گر گیا ہے۔ ایسے ہی اگر کسی سیاسی شخصیت سے آپ کو یا آپ کے ٹی وی چینل کے مالکان کو نفرت ہے یا مفادات کا کوئی ٹکراؤ ہے یا اس سیاسی شخصیت کے کسی حریف سے آپ کے دوستانہ تعلقات ہیں اور خبر ملتی ہے کہ ایک کاروباری ادارہ کے چیف ایگزیکٹو نے اس سیاسی شخصیت سے ملاقات کی ہے یا یہ کہ آپ کو ایسے واقعہ کا بھی کوئی علم نہیں لیکن آپ ایک رپورٹ تیار کرتے ہیں جس میں لکھتے ہیں ''فلاں سیاستدان نے فلاں کمپنی کے سربراہ سے تنہائی میں طویل ملاقات کی، 'ذرائع' سے معلوم ہوا ہے کہ متعلقہ کمپنی نے ایک بڑا سرکاری ٹھیکہ حاصل کرنے کے لئے مذکورہ سیاستدان سے معاملات طے کر لئے ہیں''۔ اگر ایسا واقعہ ہوا ہوتا تو پھر بھی متعلقہ کمپنی کے چیف سے یا کسی مصدقہ ذریعہ سے اس ڈیل کی تصدیق ضروری تھی لیکن اگر آپ نے ایسی تصدیق کے بغیر اور تحریری ثبوت کے بغیر یہ رپورٹ جاری کر دی ہے تو آپ کی رپورٹ پیشہ ورانہ معیار سے گری ہوئی ہے۔

ہماری صحافت اور الیکٹرانک میڈیا میں جو رویے نمایاں نظر آتے ہیں، ان میں سب سے نمایاں وہی نرگسیت ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی جارحانہ شدت کے ساتھ موجود ہے۔ ہمارا صحافی قلم اٹھاتے ہی اپنے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسے اپنے نقطۂ نظر کی صداقت کا اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا مذہبی رہنماؤں کو ہوتا ہے۔ شاید یوں کہنا زیادہ غلط نہیں ہو گا کہ ہمارے معاشرہ کا تقریباً ہر وہ شخص جسے چند لوگوں میں نمایاں حیثیت مل گئی ہے، چاہے وہ صرف ایک باپ ہے جسے اپنے دو چار بچوں اور بیوی پر فضیلت حاصل ہے، وہ خود اعتمادی کی اونچی سطح پر کھڑا ہو جاتا ہے اور اسے اپنے خیالات آخری سچائی لگتے ہیں۔

اب صحافی تو ایک ایسی شخصیت ہے جسے ایک فورم میسر ہے، جسے خبروں کا علم ہے،

جسے کسی نہ کسی سطح کے سیاستدان اور اہم لوگ اُٹھ کر ملتے ہیں۔ اب اگر وہ کسی ٹی وی چینل کا میزبان بھی بن گیا ہے تو اُس کا سیلف امیج کیا ہوگا یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسے میزبان کے منصب سے بڑھا کر اینکر پرسن بنایا گیا ہے یعنی ایسا بھاری وجود جس سے حاضرین یوں بندھے ہوئے ہیں کہ اگر یہ نہ ہو تو ان کا وجود ہی انتشار کی لہروں میں بہہ جائے۔ چنانچہ کالم لکھنے والے اینکر پرسن کی خود اعتمادی کا نرگسیت میں بدل جانا ہمارے معاشرہ کے مسلمہ اصولوں کے مطابق یقینی ہے۔ چونکہ ہمارا معاشرہ عقائد پر تعمیر ہوا ہے اور اپنی پارسائی کا یقین ہماری بنیادی تربیت میں شامل ہے، یعنی ہم چونکہ زندگی کے کسی موڑ پر اس شک میں مبتلا نہیں ہوتے کہ ہمارا موقف غلط ہو سکتا ہے، لہٰذا ہمارا سکالر، صحافی اور عالم دین، سیاستدان، تاجر، جرنیل اور جج بنیادی طور پر ایک ہی نفسیاتی سانچے میں ڈھلا ہے، جس کے پیچھے ایک ہی فضیلت ہے یعنی مسلمان ہونے کی سند اور مسلمان معاشرہ میں نمایاں ہونے کی سند۔

ایک اور دلچسپ پہلو اپنی مارکیٹ ویلیو یعنی اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھانا ہے۔ ہمارا دانشور ہو یا دکاندار، صحافی ہو رکشہ والا، اینکر پرسن ہو یا گدھا گاڑی پر تربوز بیچنے والا، اپنے مال کا معیار بڑھانے کی بجائے سودا بازی کی قوت کا بھرپور استعمال سیکھتا ہے۔ مثلاً گرمی بڑھ جائے تو برف بیچنے والا اپنے سوئے تیز کر لیتا ہے، لیکن جب تیز بارشوں میں ہماری سڑکیں نہریں بن جاتی ہیں تو پھر اُس تانگے والے کی باری ہوتی ہے جو مہنگی برف والے کو گالیاں دے رہا تھا۔ اب برف والا گالیاں دے کر دل ٹھنڈا کرتا ہے۔ لہٰذا جب ہمارے اینکر اور صحافی اپنی صلاحیتوں کا صلہ وصول کرتے ہوئے اپنے اخبار کے ارب پتی مالک کے مفادات کی خاطر حکومتِ وقت کو گالی دیتے ہیں (بشرطیکہ حکومت غیر فوجی ہو یا سابقہ فوجی ہو) یا کسی ایجنسی کے ساتھ ہم قدم ہو کر جمہوری حکومت کو کیچڑ میں گھسیٹتے ہیں، یا کسی فراخدل سیاستدان کی ماہانہ فراخدلی پر اظہار تشکر کرتے ہوئے اس کی ''اصول پرستی'' اور ''راست بازی'' وغیرہ کو تمغوں سے سجاتے ہیں تو یہ نرگسیت ہی کا ایک اور اظہار ہوتا ہے، کیونکہ اس سارے عمل کے پیچھے یہ

ایمان کام کرتا ہے کہ کرپشن اور موقع پرستی کے اس سمندر میں اس بے حد باصلاحیت شخص کو چونچ گیلی کرنے کا حق سب سے بڑھ کر ہے، جبکہ اسے اس ناقدر معاشرہ نے بہت کم دیا ہے۔

ہر شخص اور گروہ دنیا پر اثرات چھوڑتا ہے چاہے یہ اثرات کتنے ہی معمولی اور عارضی ہوں۔ یہ اثرات مثبت بھی ہوتے ہیں اور منفی بھی۔ ہم کبھی سوچنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ جن صلاحیتوں کے فخر میں ہم زمین پر ایڑی نہیں لگاتے، ان کے نتائج ہماری اولادوں، ہمارے سماج، مسلم اُمہ اور عالمی برادری پر کیا مرتب ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ ہمارا میڈیا اپنی پارسائی، رائے کی سچائی اور کارکردگی کے دن بدن بڑھتے ہوئے نشہ میں چور شاید یہ دیکھ ہی نہیں پاتا کہ خبر اور افواہ کے نتائج کتنے مختلف ہو سکتے ہیں، یا تجزیہ کاری اور تبلیغ میں کیا فرق ہے۔ اسے اس کا غم نہیں کہ جس معاشرے کی فکری تعمیر اس کا مینڈیٹ ہے وہ معاشرہ ہر نشر ہونے والی خبر کے ساتھ کتنا بے خبر ہوتا جاتا ہے اور ہر تجزیہ کے ساتھ لوگوں کے افکار کتنے بکھرتے جاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے احیائے دین کے کارکنوں اور راہبروں کو اس کا غم نہیں کہ جس معاشرہ کو انہوں نے دینی رسومات اور آداب سے بھر دیا ہے، وہ معاشرہ کردار، خوف خدا اور وقار سے کتنا خالی ہو گیا ہے۔ ہم میں سے کوئی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ہمیں اپنے گرتے ہوئے معیاروں کو سنبھالنے کے لئے اپنے موجودہ رویوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ ہم شور کرنے والے پرندوں کا وہ روایتی غول بن گئے ہیں جس میں سے ہر ایک، دوسرے کو چپ کرانے کے لئے شور کرتا ہے اور 'چپ کر'، 'چپ کر' کا یہ شور ان کو بھی شکار پر اُکساتا ہے جنہوں نے کبھی بندوق نہ پکڑی ہو۔

کیا آزادی اور غیر جانبداری کے تصورات کسی مجرد اصول پر مبنی ہیں یا یہ بھی فطرت کی ہر صداقت کی طرح اضافی ہیں؟ یہ سوال بھی زیر بحث نہیں آتا۔ اسلام کی طرح ہر سچائی جسے ہم سچائی قرار دے دیں، آخری اور ابدی اور کُلّی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہمیں یہ دیکھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ ہمارا کام کیا نتائج پیدا کر رہا ہے، کس کس کی گردن کٹ رہی ہے اور

کس کس کی چاندی ہو رہی ہے۔ مسلم معاشروں میں جمہوریت کا مقام اب تک ایک خارجی کا سا رہا ہے، جس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ مسلم معاشروں میں فضیلت واحترام کا منصب اسلامی اتھارٹی کی بنیاد پر طے ہوتا رہا ہے۔ بادشاہ اور جاگیردار کو دینی علما کی تائید حاصل رہی ہے اور انسانی علم وعقل یا رائے کو کبھی وہ سعادت حاصل نہیں ہوئی جو عقائد کو حاصل رہی ہے۔ اپنے عقائد کو آخری سچائی ماننے والے معاشرہ میں جب فاتح کا غرور بھی شامل ہو جائے اور صدیوں کی حکمرانی کی سند بھی، اور جب لوگوں کو یقین ہو کہ اُن کی کامرانیوں کا سبب ان کے عقائد ہیں، اور اِن عقائد کا علم طبقہ علما کے پاس ہے یا پھر اہل اقتدار کے پاس، تو اجتماعی انسانی رائے یا استدلال کی ضرورت کہاں رہ جاتی ہے۔ مسلم معاشروں کی ہزار سالہ فتوحات اور کامرانی نے جو فخر پیدا کیا تھا، اسے پچھلی تین چار صدیوں کی پسپائی نے کم کرنے کی بجائے مسخ کر دیا ہے۔ اب یہ فخر کبھی یادِ ماضی بن کر، کبھی احساس مظلومیت بن کر ہمیں سیکھنے سوچنے سے روکتا ہے تو کبھی فخر کی یہ مسخ شدہ شکل تشدد اور تنہائی کی طرف دھکیلتی ہے۔ ہمارے یہ معاشرے جو اپنا کوئی بھی اجتماعی کام ڈھنگ سے نہیں کر پاتے، حتیٰ کہ خوراک تک کے لئے دنیا کے محتاج ہیں، وہ عالمی مملکت قائم کرنے کے لئے ہر دم تیار ملتے ہیں۔

آسان فضیلت و اقتدار کے طلبگار عناصر نے ہماری اس مریضانہ حالت سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ میڈیا کے وہ دکاندار جن کی نظر میں پیشہ ورانہ صلاحیت کے معنی بلیک میل کی ٹیکنیک اور مال بنانے کی صلاحیت سے آگے کچھ نہیں، ہمارے معاشرے کی نرگسیت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ چونکہ اس معاشرہ کے خوشحال اور کامیاب طبقوں کو کامیاب ہونے کے لئے علم اور قدروں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی بلکہ درحقیقت وہ کامیاب ہی تب ہوئے جب انہوں نے علم اور اقدار سے نفرت کرنا سیکھا اس لئے خبر کی بجائے افواہ ان کی پسندیدہ خوراک بنی، کیونکہ خبر کا تعلق تحقیق اور سچائی سے ہے، یہ علم اور اقدار کی طاقت سے نکھرتی ہے، اسے ہضم کرنے کے لئے صحت مند معدہ درکار ہوتا ہے۔ کھٹی اور کراری مانگنے

والوں کی طلب بڑھنے سے مزید کھٹی اور مزید کراری بیچنے والوں کی دکانیں چلتی ہیں۔ معدہ کے یہ مریض اللہ کو پیارے ہوتے رہتے ہیں، لیکن نسل کشی کی طاقت سے مالا مال اس تہذیب میں نئے کھانے والوں کی تعداد گھٹتی نہیں، خصوصاً جب سادہ اور صحت بخش خوراک کے لئے خوشحال لوگوں کا دل مائل ہی نہیں ہوتا۔ دوسری طرف بدخورانی اور زہرخورانی کے زخم بھرنے کے لئے عبادت اور ثواب سہارا بن جاتے ہیں۔ چنانچہ کھٹی اور کراری افواہوں کی ہر دکان کے ساتھ دینی فضیلت کی دکانیں پھلتی پھولتی ہیں۔ ہمارے اخبارات اور چینلز پر کھٹے اور کرارے تبصروں، کالموں اور خبروں کے ساتھ ساتھ دینی فخر و فضیلت سے بھرپور صفحات، ایڈیشن اور تقاریر اسی حسین امتزاج کی مثالیں ہیں۔

اگرچہ پاکستان عالمی منظر پر کسی مثبت یا پیداواری عمل کی وجہ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ تاہم تخریب اور نفی کے کئی میدان ایسے ہیں جن میں ہماری اہمیت دنیا میں نمبر ایک ہے۔ عالمی دہشت گردی کی تربیت گاہ کے طور پر ہم بار بار نمایاں ہوتے ہیں، لیکن ہر بار ہمارا دعویٰ ہوتا ہے کہ ہمیں نمایاں کرنے کا یہ عمل سازش ہے، جبکہ اپنے لوگوں کا بارود سے اڑایا جانا یا کچی عمروں کے بچوں کا دھماکوں سے خود کو اڑا دینا روز کا دستور ہے۔ مملکتِ پاکستان کے فوجی اور سول دونوں ادارے تباہی کے اس عمل کو روکنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ فوجی آمر پرویز مشرف کے بعد منتخب اور متحد پارلیمان بے بس ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے دہشت گردی کی مذمت صرف دنیا کو سنانے کے لئے کی جاتی ہے، جبکہ معاشرہ کے سارے طاقتور عناصر دل و جان سے اسے جہاد فی سبیل اللہ مانتے ہیں، جس کے لئے مارکیٹوں سے دعاؤں کے ساتھ ساتھ بھاری مالی امداد بھی جاتی ہے۔ یعنی یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں کہ ضرر رسانی یا تباہی کے اس عمل کو کوئی بھاری تائید حاصل ہے۔ کوئی مقدس طاقت ایسی یقیناً ہے جس کی مالی اور فکری حمایت اس بربادی کو جہاد کا درجہ دے کر ہمارے نوجوانوں کو اس میں دھکیل رہی ہے۔ اگرچہ حکومت اور فوج کا ایک حصہ اسے دہشت گردی قرار دیتا ہے، دانشوروں کا ایک حصہ تباہی کے اس عمل کی

مذمت کرتا ہے اور بظاہر تمام سیاسی جماعتوں کا عزم اس کے آگے بند باندھنے کا رہا ہے۔ لیکن سبھی جانتے ہیں کہ اس دہشت گردی اور انتشار کے پیچھے چاہے کوئی بھی ہو، چاہے پاکستان کے عسکری اندھوں کا کوئی گروہ مال و اقتدار کے لئے اس ہتھیار کو استعمال کرے یا کوئی عرب طاقت اپنی عالمی سودابازی میں لگی ہوئی ہو، کوئی سابقہ عالمی طاقت اپنے گرد بننے والے گھیرے کو توڑنے کے لئے کام کر رہی ہے یا کوئی ابھرتی ہوئی طاقت موجودہ واحد سپر پاور کی جگہ لینے کا خواب دیکھ رہی ہو، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ افغانستان اور پاکستان کے بدنصیب عوام کی نوجوان نسلیں عالمی رہنما بن جائیں گی یا انہیں دنیا میں کسی بھی طرح سے کوئی فضیلت نصیب ہو سکے گی۔ جس علمی، معاشی، تنظیمی اور اخلاقی حالت میں ہم اس وقت ہیں، یعنی نہ ہماری زراعت ہے نہ صنعت، نہ ادارے ہیں نہ افراد، نہ دنیا میں کہیں سے خوش آمدید کا کوئی پیغام، ایسی حالت میں ہم چاہے پتھر پھینک پھینک کر ساری دنیا کے باغ اجاڑ دیں، باغ ہمارے نہیں ہو سکتے، نہ یہاں کے باغ نہ اگلے جہان کے باغ۔ ہم شیر، لگڑ بگھے، چیتے جو بھی بن جائیں، انسانوں کی کوئی بستی ہمیں اپنا بادشاہ نہ مانے گی۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہمارے میڈیا کا فیصلہ یہی رہا ہے کہ خودکشی کے اس عمل کی جو بھی مخالفت کرے، اسے مختلف بہانوں سے سخت نفرت کا نشانہ بنایا جائے۔

موجودہ سول حکومت پہلی بدنصیب حکومت نہیں، جسے گالیوں، کرپشن کی افواہوں اور مقدموں کے نہ ختم ہونے والے سلسلوں کا سامنا ہوا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو شہید ہونے تک ہر تذلیل کا سامنا تھا، حتیٰ کہ پارسائے اعظم ضیاء الحق نے جیل میں بند بھٹو کی لیٹرین کے پردے ہٹوا دیئے۔ کہتے ہیں بھٹو نے اپنی عزتِ نفس کے تحفظ کے لئے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ ایک رپورٹ کے مطابق تقریباً چھ فٹ قد کے بھٹو کا وزن پھانسی کے دن 100 پاؤنڈ سے بھی کم تھا۔ ملک کے سارے اہل ایمان، سارے اہل قلم اور عدل کے نگران ضیاء الحق کے آگے سجدہ ریز تھے اور بھٹو کو گالیاں دینے میں ایک سے بڑھ کر ایک۔ پھر بینظیر اور نواز شریف کی باری آ

گئی۔ میڈیا، عدلیہ اور دین کے تقریباً سارے مرکز سول حکومتوں سے نفرت پر متفق تھے۔ پارسائی اور ضمیر اور وطن عزیز کی ہر طرح کی سرحدوں کا محافظ اور دوقومی نظریہ کا پاسبان ہمیشہ جی ایچ کیو ہی ٹھہرا۔

جمہوریت کی حمایت کا کیا جواز ہے، یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے۔ جمہوریت کے مخالفین کا عمومی استدلال یہ رہا ہے کہ بقول اقبال یہ وہ نظام ہے جس میں ''بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔'' تولنے سے مراد غالباً یہ ہے کہ شخصیت کے وزن اور وقعت کا اندازہ لگایا جائے۔ اب سوال پیدا ہوگا کہ یہ اندازہ کون لگائے؟ ہر وزنی شخصیت کے حامی اور مخالف ہوتے ہیں۔ کیا ان کی رائے لی جائے جو حامی ہیں یا ان کی جو مخالف ہیں؟ اب حامیوں اور مخالفوں کی رائے کا وزن اور وقعت کیسے معلوم کریں؟ کیا کوئی ایسا ترازو موجود ہے جس میں یہ وزن کیا جا سکے؟ ایک اور سوال یہ اُٹھے گا کہ اگر کسی شخصیت کا وزن اس کی ساکھ اور شہرت سے دیکھا جائے گا تو یہ ساکھ اور شہرت کیسے بنی؟ اگر ایک فوجی جرنیل جو تیس برس سے زمانہ کی آنکھ سے چھپا رہا ہے، اب سپہ سالار بن گیا ہے۔ تو اس کی صلاحیتوں کا وزن کیسے کیا جائے۔ جنرل یحییٰ، جنرل ضیا اور جنرل پرویز قوم کی رہنمائی کے لئے اچانک تشریف لائے، کسی سے تولنے کو کہا گیا نہ کسی کو اس کی جرأت ہوئی۔ یہ حضرات کتنی صلاحیتوں کے مالک تھے، اب ساری دنیا کو خبر ہے، لیکن ان کے حامیوں اور حواریوں کی رائے میں ان جیسا حکمران اللہ کبھی کبھی قوموں کو عطا کرتا ہے۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ تولنے کے لیے کن صلاحیتوں کو تولا جائے، کیا امتحانی پرچوں میں زیادہ نمبر لینے والے کو پکڑ کر حاکم اعلیٰ بنا دیا جائے؟ یا سب سے کامیاب کھلاڑی کو؟ ممکن ہے کوئی کہے کہ سب سے بڑے تاجر کو بادشاہ ہونا چاہیے، یا وہ شخص جس نے ارکان اسلام کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہیں کی وہ بہتر حکمران ہوگا۔ ایک دانشور یہ کہہ سکتا ہے کہ ریٹائرڈ پرنسپل جسے بہت سے انگریزی مقولے یاد ہوں ملک کو خوب چلائے گا۔ ایک مصنف،

کالم نگار یا اینکر پرسن جس نے بڑے بڑوں کی خاک اُڑائی ہو، یا کوئی میڈیا باس جس نے ہر دور میں بلیک میل کے فن سے میڈیا مملکت بنائی ہو، ملک کو چار چاند لگا دے گا۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ شاعرِ مشرق نے جمہوریت کے عفریت کی جگہ جس صالح نظام کی خواہش کی تھی اسے دعوت و ترغیب کے ذریعے نافذ کیا جائے یا عقابی روح والے پُر اسرار بندوں کی یلغار سے؟ اور کیا یہ یلغار اپنے ہی مسلم عوام پر کی جائے گی؟ اگر ایسی یلغار صرف دشمن کے لیے ہے تو اپنے وطن میں مسلم عوام کے لیے اپنی حکومت مقرر کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

دنیا بھر کے مفکروں نے ان اُلجھے ہوئے مسائل کا ایک ہی باعزت حل مانا ہے۔ پورے معاشرہ کی شمولیت کا نظام۔ یہی وہ حل ہے جو اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جمہوریت ایک طرزِ فکر ہے، یہ ضابطۂ حیات ہونے کا دعویٰ کئے بغیر حیات کے بہت شعبوں میں بہترین نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اس طرزِ فکر کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ جبر اور قوت انسانی صلاحیت کی معراج نہیں بلکہ دلیل اور علم سے پیدا ہونے والا اجماع شرفِ انسانی ہے۔ زندہ لوگوں کے اختلاف کا شور قبرستان کی خاموشی سے بہتر ہے کیونکہ یہ اختلاف تربیت کے مرحلوں سے گزر کر ایسے افکار کو جنم دیتا ہے جو مستقبل کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

ایک آزاد میڈیا کا رول غالباً یہ نہیں ہوگا کہ وہ نظامِ حکومت کی مفصل بحث کئے بغیر جمہوریت کے عالمی اور عالمانہ تصور کو مسترد کر دے۔ خصوصاً ایسے حالات میں کہ میڈیا کے کم لوگ اعلیٰ درجہ کے محقق یا مفکر ہوں۔

ایک ایسا ملک جس میں صحافت کے ارب پتی مالکان، تجارت اور بینکاری کے خداوند اور صنعتوں کے قطب مینار، اکثر و بیشتر سکول سے دوڑے ہوئے چنڈال ہوں، اور باضمیر قلم والا ان کے میموریل اخبار، ہاؤسنگ سوسائٹی یا بینک میں نوکری کر کے فخر کرتا ہو، جہاں عدل کے بڑے سے بڑے ہیرو کا طرزِ کلام جہالت اور تکبر پر مبنی دکھائی دیتا ہو، جہاں

جنرل ضیاء جیسا شخص سارے عالموں اور مفکروں کا معبود بن سکتا ہو، وہاں علم اور کردار کی بحث میں صرف جمہوری حکومت کی نااہلی کو ساری گولیوں اور گالیوں کا نشانہ بنانا کیا میڈیا کی آزادی ظاہر کرتا ہے یا کسی بڑے منصوبے کا اعلان؟ کیا یہ سب کسی بڑے جبر یا قیمتی انعام کے بغیر ممکن ہے؟

جرات تحقیق www.RealisticApproach.org جرات تحقیق

پاکستان کی سیاست میں 1973ء کے آئین کے علاوہ متفقہ فیصلوں کی کوئی مثال موجود نہیں (یعنی آمر کے حکم کی تائید میں لگائی ہوئی مہروں کو چھوڑ کر) اور اس ایک مثال کا سہرا بھی سیاست دانوں کے سر ہے۔ اس کے بعد پہلی بار موجودہ سول حکومت نے متفقہ فیصلوں کی کچھ مثالیں قائم کی ہیں۔ کیا ان اچھی روایتوں کو عدلیہ یا میڈیا کی تائید حاصل ہوئی؟ اگر ہمارا میڈیا، ہمارے قانون دان، ہمارے منصف اس کڑے وقت کو کڑا وقت مانتے، اُجڑی ہوئی اور خودکشی کرتی ہوئی نوجوان نسل کو سنبھالنے میں کوئی دلچسپی رکھتے، اپنے عوام کی اذیت کو کم کرنے کے لئے عالمی برادری سے استفادہ کرنے کو تیار ہوتے تو مثبت اتحاد کی موجودہ کوششوں کی تحسین کوئی مشکل بات نہ تھی۔ بلکہ اتحاد اور مثبت فیصلوں کو گالیاں دینے کا عمل حقیقت میں مشکل کام تھا جسے ہمارے میڈیا نے کمال ثابت قدمی سے سرانجام دیا ہے، جو ثابت قدمی کا ایک نیا ریکارڈ ہے۔ اس ثابت قدمی سے جو نتائج نکلیں گے، اس کی پرواہ تو وہ کریں جن کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ جن کی چاندی ہو رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ پارسائی کے تمغے بھی سینوں پر جھول رہے ہیں، انہیں نتائج دیکھنے سے کیا۔

عساکرِ پاکستان اور عدلیہ کی تاریخ ہمارے ہاں قربانیوں کی تاریخ نہیں، نہ ہی علما کی تاریخ میں عوام کے لئے یا قومی مقاصد کے لئے کسی قربانی کا کوئی ریکارڈ ہے۔ جبکہ جمہوری جماعتوں کا رول اس سلسلے میں شاندار رہا ہے۔ کیا اس سارے عمل میں میڈیا کا کردار بھی قابل فخر رہا ہے؟ کیا یہ محض اتفاقیہ ہے کہ جمہوری سیاستدانوں کو بدترین مذمت کا سامنا ہے؟ جس یکسوئی کے ساتھ میڈیا نے سیاست اور جمہوریت کو نفرت اور تذلیل کا نشانہ بنایا ہے اور ایک یا

چند ملازمت پیشہ افراد کو ملک وقوم کے سیاہ وسفید کا مالک بنانے کی کوشش میں توازن کے تمام اصول ترک کر دیئے ہیں، اس سے اکثر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی بہت ہی جابر یا بہت ہی فیاض ہاتھ مصروفِ کار ہے۔ ایسا ہاتھ جس کا جبر قاہر یا فیض وافر ہے۔

ساری دنیا کو علم ہے کہ پاکستان میں میڈیا اور عدلیہ کی آزادی کس نے روکی اور کب تک۔ شاید ہم سب جانتے ہیں کہ فوجی اور مذہبی قیادت دونوں ہی آزادیٔ رائے کے مخالف رہے ہیں۔ سیاسی اور آئینی معاملات پر غور وفکر کا عمل سب سے پہلے ایوب خان کے دور میں روکا گیا، ضیاء الحق نے سیاسی عمل پر مکمل پابندی لگائی اور آئین کو کوڑے کی ٹوکری میں پھینکنے کی صرف بات ہی نہیں کی بلکہ عملاً ایسا کیا۔ سیاستدانوں کے بارے میں کچھ اس طرح کے الفاظ کہے کہ ''میں جب چاہوں یہ دُم ہلاتے ہوئے آجائیں گے'' اور عملاً ملک کے سب سے مایہ ناز سیاستدان کو عدالت کے ذریعے قتل کرنے کے علاوہ ملک کی سب سے بڑی جماعت اور دانشوروں کو گیارہ سال تک قید اور اذیت میں رکھا۔ پھر پرویز مشرف نے یہی سارا عمل روشن خیالی کے نام پر دہرایا، اور پیپلز پارٹی کے ساتھ ساتھ دوسری بڑی سیاسی جماعت مسلم لیگ (ن) کے رہنماؤں اور کارکنوں کو مارا اور رگڑا گیا۔

پرویز مشرف نے میڈیا کو پھیلنے کی اجازت دی اور سول سوسائٹی کی مہمل اور فیشن ایبل آزادی کا ڈرامہ رچایا، مگر ان اقدامات کا مقصد سیاسی جمہوری عمل کو نظروں سے اوجھل کرنا اور حقیقی، فکری تحریکوں کو کنفیوز کرنا تھا۔ یہ عمل ایوب خان کے دور میں بھی ٹیلی ویژن کے اجرا کی صورت میں ہو چکا تھا۔ ٹیلی ویژن کا اجرا عوامی تربیت کے لئے نہیں تھا بلکہ توجہ مبذول کرانے کے لئے تھا۔ ضیاء الحق کے دور میں پی ٹی وی کے ڈراموں کی بوچھاڑ اور سینماؤں و پارکوں کو اُجاڑ کر وی سی آر فلموں کی بلا روک ٹوک اجازت اسی بنیادی پروگرام کا حصہ تھے، جسے پرویز مشرف نے جاری رکھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ الیکٹرانک میڈیا کی یلغار سے رائے عامہ بکھر کر گڈمڈ ہو جائے اور ملک بھر میں لوگ اجتماعی سرگرمیوں اور سنجیدہ قومی

معاملات میں دلچسپی لینے سے باز رہیں یعنی سیاسی اور فکری عمل قوم کے معمولات سے نکل جائے، یعنی وہ سیاسی اور فکری عمل جس کا بڑے پیمانے پر آغاز 1960ء کے عشرے میں ہوا تھا اور جس کے جاری رہنے کی ضمانت 1973ء کے آئین نے فراہم کردی تھی۔

پرویز مشرف نے الیکٹرانک میڈیا اور سول سوسائٹی سے جو کام لینا تھا، لیا۔ یعنی حتی المقدور فکری انتشار جو مختلف چینلز کے آپس کے اختلافات کی وجہ سے پیدا ہونا فطری تھا۔ مگر فوجی آمروں نے سماجی انتشار اور فکری جمود کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لئے کچھ قوتوں کو اپنا حلیف بنایا تھا یعنی فوجی قائدین کا ایک گروہ جو ہر آمر کے ساتھ بڑا ہوتا گیا دوسری عدلیہ جسے ہر آمر کو آئین سے اونچا کرنے اور ہر سیاسی حکومت کو آئین کے ذریعے دبانے کا کام دیا گیا، تیسرے مذہبی اکابرین جو وقت کے ساتھ خود مختار ہوتے گئے، چوتھے جہادی گروہ جو بالآخر افواج پاکستان کے حریف بن گئے اور پانچواں تجارت پیشہ میڈیا جسے سیاست، علم وفکر اور انسانی وسائل کی تعمیر سے نہ صرف دلچسپی نہیں بلکہ نفرت ہے، کیونکہ یہ چیزیں ایک کرپٹ معاشرہ کے تجارتی عمل میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ آمریت اور کرپٹ تجارت کا فطری خاصہ ہے کہ یہ معاشرہ کو منتشر دیکھنا پسند کرتی ہیں کیونکہ معاشرہ کی متحدہ قوت سے انہیں خوف آتا ہے، جبکہ جمہوری سیاست معاشرہ کو متحد کرتی ہے کیونکہ اسے گروہ بندی کی طرف سے خطرہ ہوتا ہے۔

یہ گروہی قوتیں جن کو ہر آمر نے ساتھ لیا، کسی ایک آمر سے بیزار ہوسکتی ہیں، ان کے اندرونی اختلافات بھی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں لیکن ان قوتوں کی سردار ابھی تک ہماری عسکری قیادت ہی ہے، جو ایک آمر کو ہٹانے کے بعد اگلے جرنیل کی بادشاہت کے لئے تیاری کرتی ہے۔ یہ جانشینی کی جنگ ہوتی ہے، جسے مکمل کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ قومی اور عالمی سطح پر پاکستان کے سیاسی عمل کو ایک بار پھر سامنے لاکر ایک بار پھر ذلت اور رسوائی میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ یہ عمل سب کے سامنے ہے جس میں فوج کے سربراہ کی تعظیم، عدلیہ کے سربراہ کی تقدیس اور سیاسی رہنماؤں کی تذلیل واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ منتخب سیاسی

رہنماؤں کے اختیارات پر شدید اور غیر مہذب حملوں کے ساتھ ساتھ مذکورہ شخصیتوں کی غیر مشروط اطاعت پر اصرار اور تبلیغ اسی جانشینی کی تیاری کا عمل ہیں۔

ایک ایسا میڈیا جو نہ تو فوجی قیادت پر تنقید کرے نہ ہی ججوں کی غیر عدالتی گفتگو پر اعتراض کر سکے، جسے اختیار نہیں کہ مذہبی جماعتوں اور علما کی طرف سے لگائی گئی فکری پابندیوں کی خلاف ورزی کرے، حتیٰ کہ مساجد کے غیر قانونی تجاوزات اور نماز جمعہ کے لئے سڑکوں پر قبضہ کر کے ٹریفک روک دینے کے عمل پر کوئی اخبار یا ٹی وی چینل اختلافی تبصرہ تک کرنے کی جرأت نہیں کرتا، میاں نواز شریف کی منتخب جمہوری حکومت کو جناب جسٹس سجاد علی شاہ نے گرانے کی کوشش کی تو ہمارے میڈیا نے مسلم لیگ (ن) کی مذمت کی اور کبھی عدلیہ کے اس رول کو بے نقاب نہیں کیا، کیا اسے آزاد میڈیا کہا جا سکتا ہے؟ اور کیا یہ پابندیاں جو میڈیا نے بخوشی قبول کی ہوئی ہیں سیاسی جماعتوں نے لگائی ہیں؟ ایسا ہوتا تو کیا میڈیا اسے بخوشی قبول کرتا جیسا اس وقت اس نے کر رکھا ہے؟ کیا میڈیا اپنے کندھے پر خود تھپکی دے کر یہ فخر کر سکتا ہے کہ وہ آزاد ہے؟ صرف اس لئے کہ یہ ٹوٹی پھوٹی ہوئی جمہوری قیادت کو کھل کر گالی دے سکتا ہے، ایک ایک دن کا حساب مانگ سکتا ہے، فوج کو مداخلت کے لئے بلا سکتا ہے یا عدلیہ کو اُکسا سکتا ہے کہ وہ کسی غیر آئینی آمریت کے لئے راستہ ہموار کرنے کی مہم میں آلہ کار بن کر آئینی حکومت سے تصادم کر لے، حتیٰ کہ اسے چلنے نہ دے؟ کیا یہ آزادی ہے کہ اگر کوئی ترقیاتی یا انتظامی معاملہ کسی نتیجہ پر پہنچنے لگے تو میڈیا عدالت عظمیٰ کا دروازہ کھٹکھٹا کر حکمِ امتناعی حاصل کرے، پھر اخباروں اور چینلز پر الزامات کی بوچھاڑ چلائے اور پبلک کو حکومت کے خلاف سڑکوں پر آنے کے لئے اُکسائے؟ کیا ایک کمزور جمہوریت کو مزید کمزور کرنے کا عمل ہی آزادیٔ ابلاغ ہے؟ کیا ابلاغ ایک مجرد اور آفاقی قانون ہے؟ کیا ہمارا میڈیا ہمیں جہادی گروہوں، مذہبی جماعتوں، ججوں اور جرنیلوں کی بے قاعدگیوں سے بھی آگاہ کرتا ہے؟ یا پھر کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ عناصر نعوذ باللہ! اللہ کے مقرر کردہ ہیں اور انبیا کی طرح ہر خامی اور

گناہ سے پاک ہیں؟ جن کے بارے میں کسی کمزوری کا کبھی کوئی انکشاف نہیں ہوا جبکہ قوم اُن کے لگائے ہوئے زخموں کو پچاس سال سے چاٹ رہی ہے جو زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے بلکہ اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ اگر ان کے بھی کچھ اعمال قوم کو اور اردگرد کے لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں تو وہ اعمال کیا ہیں، اس کا تذکرہ کیوں نہیں ہوتا؟

پاکستان کے موجودہ حالات میں کیا یہ ضروری نہیں کہ وہ جدید علوم و افکار، جنھوں نے میڈیا اور عدلیہ کے موجودہ تصورات کو جنم دیا ہے، اس ملک کے عوام تک لائے جائیں؟ اور جس مذہبی اور فوجی تسلط نے اس ملک وقوم کو پچاس برس میں اردگرد کے ملکوں سے سو برس پیچھے دھکیل دیا ہے، اُس سے نجات حاصل کرنے میں قوم کی رہنمائی کی جائے؟ اگر اس میڈیا کو ایسا کرنے کی نہ ہمت ہے نہ نیت تو پھر ہم اسے شاید آزاد میڈیا نہیں کہہ سکتے، چاہے یہ آزادی طاقت ور گروہوں کی دہشت نے سلب کی ہے یا یہ میڈیا کے مالکان کا جبر ہے۔ جو بھی ہے بہرحال موجودہ حالات میں ہمارا میڈیا صرف ننگے مفادات کی تکمیل کا ایک تازہ ہتھیار دکھائی دیتا ہے۔

Jurat-e-Tehqiq

عدلیہ کے تقدس کا مبالغہ

ایک نازک اور اہم مبالغہ عدلیہ کی آزادی کا بھی ہے۔ ہم میں سے ہر کوئی چونکہ کم از کم باون گز کا ضرور ہے، لہٰذا عدلیہ کے تقدس کی دیوار کا مسلح افواج کے تقدس کی دیوار کی طرح آسمان تک اونچا ہونا ضروری تھا۔

عدلیہ کی آزادی اور تقدس کا موجودہ تصور دنیا کے جمہوری ممالک سے آیا ہے۔ یہ عدلیہ کے اسلامی تصورات سے پیدا نہیں ہوا۔ ''ہماری اپنی'' روایت میں تو خلافت کا نظام مثالی ہے، جس میں خلیفہ وقت بیک وقت چیف ایگزیکٹو، چیف جسٹس اور سپریم کمانڈر ہوتا تھا، اور مجتہدِ اعلیٰ بھی، یعنی مقننہ بھی وہی ہوتا تھا۔ خلافت کے بعد یہ استحقاق بارہ صدیوں تک ہمارے مسلم بادشاہوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ استعمال کیا۔ اور یہ اسلامی روایت آج کے ایران اور سعودی عرب میں پورے فخر کے ساتھ، کسی معذرت کے بغیر جاری و ساری ہے۔

ترقی یافتہ دنیا نے عدالت کا احترام اگرچہ قانون کی شکل میں نافذ کیا یعنی توہینِ عدالت کے قوانین بنائے، لیکن اس کی بنیاد میں قانون کے علاوہ تین مضبوط عوامل کام کرتے ہیں۔

1 ایک تو یہ کہ یہ احترام ان معاشروں کے کلچر میں موجود ہے یعنی یہ معاشرے قانون کا احترام کرتے ہیں لہٰذا عدلیہ کا احترام اس کا فطری نتیجہ ہے۔

2 دوسرے یہ کہ جج اس تقدس کو قائم رکھنے کے لئے اپنے طرزِ عمل، اپنی گفتگو اور

کردار کی حفاظت کرتے ہیں، یعنی ذاتی ہیروز کی شکل میں ملک وقوم کے مالک بن کر بلند آواز میں للکارنے اور دھمکانے اور اپنی بڑائی کا اظہار کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

3 تیسرے یہ کہ یہ تقدس جج کا نہیں بلکہ عدالت کا ہوتا ہے، یعنی جج کو عدالت بننے سے پہلے اپنی غیر جانبداری اور آئین پرستی کے ثبوت فراہم کرنے پڑتے ہیں اور اہم عدالتی منصب پر تقرر سے پہلے جج کو ملک کے منتخب نمائندوں اور عوام کے سوالوں کا جواب دینا پڑتا ہے جس میں اس کا انداز ایک امیدوار اور ماتحت کا سا ہوتا ہے، ایک مشتعل ہیرو کا نہیں۔ اس کے عدالتی اور ذاتی ماضی کو باز پرس سے گزرنا پڑتا ہے تاکہ اِس امر کی زیادہ سے زیادہ ضمانت حاصل کی جا سکے کہ جج اپنے ذاتی میلانات وتعصّبات اور مزاج کی کمزوریوں کو آئین پر فوقیت نہ دیتا ہو۔

جدید معاشروں کے اخلاقی معیار صدیوں کی علمی روایت سے نکلے ہیں۔ یہ معاشرے مفکر، فلسفی، سائنسدان، ادیب اور سیاسی نظریہ ساز کی جگر سوزی سے بنے ہیں، نہ کہ پادری، پنڈت یا مولوی کے فتووں سے۔ نظامِ تعلیم صدیوں سے ایسا رہا ہے جو قانون اور اصول کا ادب سکھاتا ہے۔ عام آدمی سے لے کر بڑے سے بڑے دانشور تک کوئی شخص دیانتداری کو حماقت نہیں سمجھتا۔ پیشہ ورانہ ذمہ داری ایک مسلمہ اصول ہے۔ چنانچہ جج معاشرہ کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے پیشہ ورانہ عمدگی کی ازحد کوشش کرتا ہے۔

تقدس جبر نہیں۔ ہر تقدس کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اگر ان تقاضوں کو پورا کئے بغیر تقدس قائم کیا جائے تو یہ جبر سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ تقدس کا پہلا اور اہم ترین تقاضا عدل ہے، غالباً اتنا ہی اہم تقاضا علم وصلاحیت ہے، جس سے دلوں میں تعظیم پیدا ہوتی ہے۔ ایسی ہی ایک خوبی پیشہ ورانہ غیر جانبداری ہے۔ جج کی شاندار صفات میں ہم غالباً سنجیدگی، غیر جذباتی توازن اور غیر شخصی وقار کی توقع کرتے ہیں۔ بلکہ یہ صفات شاید جرنیل اور پولیس

مین تک ہر اہم اجتماعی منصب کے حامل شخص کو قابل عزت بناتی ہیں اور تقدس اگر ضروری ہے تو ان کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

صرف جرأت ہی نہیں بلکہ عدل، علم، صلاحیت، پیشہ ورانہ غیر جانبداری، سنجیدگی، تدبر، غیر جذباتی توازن اور غیر شخصی وقار، اتنی ساری خوبیاں اس لئے ضروری ہیں کیونکہ عدلیہ کے ان افراد کو معاشرہ اپنے منتخب نمائندوں سمیت سارے نظام کی نگرانی کا اختیار دیتا ہے۔ یہ اختیار طالعِ آزماؤں یا ناجائز مفادات کے خواہش مندوں کے کسی گروہ کو دینا خطرناک ہوسکتا ہے جیسا کہ پاکستان کی تاریخ میں ہوا ہے۔ کمزور کردار کے لالچی سرکاری ملازمین جن کا زندگی میں کوئی بڑا نصب العین سوائے ذاتی کامیابی کے موجود نہیں، جبکہ معاشرہ خود اقدار سے خالی ہے، کسی بھی مرحلہ پر کسی آمر کے مقاصد کے آلاتِ کار بن جاتے ہیں۔

کیا کسی معاشرے کے جج سارے معاشرے کی ذمہ داریاں پوری کر سکتے ہیں یعنی انتظامی بھی، ٹریفک کے معاملات بھی، ترقیاتی منصوبے بھی، غیر ملکی کمپنیوں سے کئے جانے والے معاہدے بھی یعنی سوائے مسلح افواج کے معاملات کے تمام معاملات کو یہ کہہ کر اپنے چارج میں لے سکتے ہیں کہ یہاں کرپشن کا خطرہ ہے، کیا یہ ان کا مینڈیٹ ہوسکتا ہے؟ اگر معاشرہ یہ چاہے کہ کوئی جج معاشرہ کی بزدلی اور بے حسی کا کفارہ ادا کرتے ہوئے آمر سے لڑ جائے تو کیا اس کی توقع بطور ایک اصول کے کی جاسکتی ہے؟ کیا جج کی ذمہ داریوں میں یہ ذمہ داری ہوسکتی ہے کہ وہ آمر کا مقابلہ کرے؟ کیا معاشرہ کی کوشش کے بغیر صرف جج آمریت کا راستہ روک سکتا ہے؟

عدلیہ کے منصب پر فائز ہونے والوں سے کیا ایسا کوئی امتحان لیا جا سکتا ہے، جو اِن افراد کی جرأت اور اخلاقی ہمت کا اندازہ لگانے میں مدد دے؟ اگر نئے ججوں کا انتخاب کسی ایک جج کی ذمہ داری بنا دی جائے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ انتخاب کرنے والا جج اُن تمام خوبیوں کا جائزہ لینے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے جن کی نئے جج سے توقع کی جارہی ہے؟

اگر نہیں تو ایسا ٹیسٹ کون لے گا؟ اگر ایسا ٹیسٹ نہیں لیا گیا تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ جب کوئی جرنیل یا دہشت گرد آئین سے بغاوت کرے گا تو اس کا مقابلہ ججوں کا ایک گروہ کرے گا جبکہ معاشرہ اپنے سیاستدانوں کو اور سیاسی جماعتوں کو مسترد کر چکا ہو؟ جیسا کہ اس وقت پاکستان میں میڈیا کا ایک بااثر گروہ کرانے کی کوشش کر رہا ہے؟

اگر معاشرہ یعنی عوام کے موثر یا اکثریتی طبقے آمر کی اطاعت سے انکار نہیں کرتے یا ان کا یہ انکار صحیح معنوں میں آئین کی سربلندی کے لئے نہیں بلکہ کسی اور مقصد کے لئے ہے، تو سرکاری ملازمین کے کسی گروہ کی بغاوت بے معنی ہے۔ پھر کیا ہمارے ملک میں آمروں کے خلاف بغاوت ہمیشہ آئین اور جمہوریت کی سربلندی کے لئے ہوتی ہے؟ کیا جامعہ حفصہ کے طلبہ اور طالبانِ پاکستان کی حالیہ بغاوتیں آئین اور جمہوریت کی سربلندی کے لئے تھیں؟ اگر آمر کے خلاف پچھلی بغاوت جس میں عدلیہ کی آزادی کا نعرہ بلند ہوا، آئین اور جمہوریت کی بحالی کے لئے تھی، تو پھر منتخب حکومت کو مختلف حیلے بہانوں سے گرانے کی انہی عناصر کی طرف سے کوشش کیوں جاری ہے جنھوں نے آمر کی مخالفت کی؟ اگر آمر اور منتخب حکومتوں کو منظر سے ہٹا کر ججوں کے ذریعے حکومت چلانا مقصود ہے تو پھر ایسی حکومت کو کیا کہا جائے گا؟ اور سرکاری ملازمین کی اس غیر منتخب حکومت اور جرنیلوں کی حکومت میں کیا بنیادی فرق ہے؟ اب اگر مقصد آئین کی پاسداری ہے تو آئین تو انتخابات کے ذریعے عوام کے نمائندوں کو حکمرانی کا منصب اور حق دیتا ہے! ایسے منصب کے لئے سیاسی جماعتیں عوام کی طاقت کو منظم کرتی ہیں۔ اگر ان جماعتوں کا وقار ہر اچھے برے ہتھکنڈے سے تباہ کر دیا جائے تو آنے والے آمر کا راستہ کون روکے گا؟ کیا وکیل اور صحافی ملک کے سارے عوام کی جگہ ملک کی تقدیر کا فیصلہ کریں گے؟ تو پھر ملک کے باقی عوام کی حیثیت کیا ہے؟

تقدس اور فضیلت کے مقام کے لئے جن صفات کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، یہ صرف اسلامی معاشرہ میں ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر تسلیم شدہ صفات سمجھی جاتی ہیں۔ کیا ہمارے ہاں اعلیٰ

سرکاری ملازمتوں کے لئے منتخب ہونے والے امیدواروں میں ایسی صفات کا ہونا کبھی شرط رہا ہے؟ کیا ہماری عدلیہ کے جج صاحبان کے چناؤ میں ایسا کوئی طریقہ کار رائج ہے یا اس کا کوئی طریقہ زیرِ غور ہے؟ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اگر تقدس کا مقام جج حضرات کے لئے ضروری ہے کہ جیسا کہ ہمیں آئین اور روایت سے معلوم ہوتا ہے، تو کیا تقدس دلانے والی ان صفات کا ہونا غیر ضروری ہے؟ اگر ضروری ہے تو ان صفات کی پرکھ کے لئے کسے اختیار حاصل ہے؟ اگر سینئر اور موجود جج صاحبان نئے ججوں کا چناؤ کریں گے تو کیا یہ طے ہے کہ جو بھی سینئر جج ہے وہ ان صفات کا تعین کرنے کے لئے سب سے موزوں شخص ہے؟

اگر تقدس بغیر صفات کے صرف اس لئے ضروری ہے تا کہ جج جو چاہے کر لے، اگر کوئی اختلاف کرے تو مردود اور توہین عدالت کا مرتکب قرار پائے، جس کی سزا بھی اسی عدالت کے ہاتھ میں ہو جس کی توہین ہوئی ہے، تو پھر انصاف اور عدل کے تقاضے کیا ہوئے؟ اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ ایسے جج کے فیصلے انصاف کے اصولوں پر ہی ہوں گے، جبکہ اس سے اوپر کوئی اور نظام عدل موجود نہیں جہاں اس کی شکایت کی جا سکے۔

ایک اور سوال جج اور عدالت میں امتیاز کرنے کا ہے۔ کیا جج کا ہر اقدام، اس کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ، اس کا ہر لہجہ یعنی اس کی ترشی، تلخی، نوازش اور مزاح سب کچھ عدالت کے احکام کا درجہ رکھتے ہیں؟ کیا اس میں ایک مطلق العنان بادشاہ کے دربار کا سا ماحول دکھائی نہیں دیتا؟ کچھ عرصہ سے میڈیا میں رپورٹ ہونے والی عدالتی کارروائیوں میں بعض جج صاحبان کے ایک ایک لفظ کو کچھ ایسا تقدس دیا جاتا ہے کہ جیسے نعوذ باللہ! کسی نبی کے الفاظ۔ سوال یہ ہے کہ اگر محترم جج صاحب سامنے کھڑے ہوئے ایک سرکاری افسر کو ''تو'' یا ''تم'' کے الفاظ سے مخاطب کرتے ہوئے یہ کہیں کہ اگر تم نے تین دن کے اندر صدر کو گرفتار کر کے اس عدالت کے سامنے پیش نہ کیا تو تمہیں ڈس مس کر کے جیل میں ڈال دوں گا تو ان الفاظ کا قانونی یا آئینی مقام کیا ہوگا؟ اس کا تعین کون کرے گا؟ اور اس افسر کو کون بچائے گا؟

دوسری بات یہ کہ یہ سرکاری اہلکار جو جج صاحب کی طرح مملکت کا ایک اہلکار ہے، اگر عمر میں جج صاحب سے بڑا ہے، اس پر ایسا کوئی داغ بھی نہیں جو اسے ذلت کے قابل ثابت کرے، تو یہ جج صاحب کے لہجے کی ذلت آمیز سختی اور اذیت کیوں سہہ رہا ہے؟ بطور انسان کوئی بھی شخص چاہے کسی مکروہ جرم میں گرفتار ہو کر عدالت کے سامنے پیش کیا گیا ہو، مجرم ثابت ہونے تک بے گناہ تصور کیا جاتا ہے، لہٰذا انسانی شرف اور عزت کا حقدار ہوتا ہے۔ اس تناظر میں جج صاحب کا یہ رویہ یا لہجہ کیا ان کی قوتِ عدل پر حرف نہیں اٹھاتا؟ کیا اس شخص کا ذاتی تذلیل پر احتجاج توہینِ عدالت کے دائرہ میں آئے گا؟ اور اگر اسے احتجاج پر سزا دے دی جائے کہ اس نے ذاتی تذلیل پر جج صاحب کے سامنے احتجاج کیوں کیا تو کیا اس سے انصاف کے تقاضے پورے ہوں گے؟

یا اگر جج صاحب کسی مقدمہ کی سماعت کے دوران معافی کی درخواست کے جواب میں کہیں کہ ''میرے ساتھ فلاں شخص نے فلاں موقع پر زیادتی کی تھی، میرے ساتھی جج کو کچھ لوگوں نے بالوں سے پکڑا تھا، اب ہم سے معافی کی امید کیسے کی جا سکتی ہے۔ معافی کا وقت گیا، اب کوئی معافی نہیں ملے گی۔'' جبکہ معافی کی درخواست کرنے والے اس شخص کا تعلق کسی طرح سے اس واقعہ سے نہیں جس کا جج صاحب ذکر کر رہے ہیں، بلکہ وہ صرف حکومت کا اہلکار ہے اور حکومت کے کسی اور اہلکار یا وقت کے آمر نے جج صاحب کے ساتھ گستاخی کی تھی، تو کیا معافی کے سلسلے میں جج صاحب کے یہ ریمارکس عدل کے غیر جانبدارانہ عمل میں شمار ہوں گے؟ اگر نہیں تو اس کی شکایت کہاں کی جائے گی؟

ایک اور سوال جج صاحبان کے احتساب کا ہے۔ جج صاحبان کے انتخاب کی طرح اُن کی انسانی کمزوریوں یا بے قاعدگیوں کا احتساب بھی ان کے اپنے ہی ایک گروہ کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ معاشروں میں بھی بعض اوقات ایسا ہی اصول دکھائی دیتا ہے۔ شاید طویل تربیت سے گزرے ہوئے معاشرے اور نظام یہ جواز پیش کریں کہ ان کے ہاں

پیشہ ورانہ دھڑے بندی اتنی آگے نہیں جاتی کہ قانون شکنی کی شکل بن جائے۔ لیکن کیا ہمارے ہاں قانون کے احترام کی روایت اتنی ہی گہری ہے کہ اگر کسی جج کا بیٹا ٹریفک کی خلاف ورزی میں پکڑا جائے تو اسے قانون سے استثنیٰ نہیں ملے گا؟ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ خود جج صاحب اگر ایسی خلاف ورزی کریں تو پولیس والا ان کا چالان کردے گا اور اگر ان پر پولیس کو دھمکانے کا الزام آجائے تو عدالت میں انہیں اسی طرح پیش ہونا ہوگا جیسے کوئی عام شہری؟ اور کیا اُن کا ہم منصب یا سینئر جج ان کی طرفداری نہیں کرے گا؟ کیا اس طرح کے خصوصی حقوق و استثنیٰ عدلیہ کے فاضل ارکان کو معاشرے کے کروڑوں عوام و خواص سے کہیں زیادہ بااختیار اور قانون سے بالاتر نہیں بناتے؟

ہمارے مسلم معاشرہ میں عدالت اور فوج کو جو تقدس حاصل ہے، اس کے پیش نظر صورت حال اور بھی سنگین ہو جاتی ہے۔ شاید اسی روایتی تقدس کی آڑ میں کچھ عناصر موجودہ سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کو ذلت میں ڈال رہے ہیں، جس کا ایک منطقی نتیجہ فوجی آمریت کی بحالی اور دوسرا طوائف الملوکی ہے جس میں کچھ لوگوں کو اسلامی انقلاب کی امید ہے۔ کیا یہ عناصر سادگی اور خلوص کی شدت میں ایسا کر رہے ہیں؟ یعنی کیا یہ لوگ پاکستان کے لئے فوج کی حکومت احسن خیال کرتے ہیں؟ کیا طوائف الملوکی کے بعد سخت گیر مسلمانوں کی حکومت یقینی ہے؟ اگر یقینی ہے تو ایسی حکومت کے قیام کے نتائج کیا یقیناً مثبت ہوں گے؟ کیا سخت گیر اسلامی حکومت میں عدلیہ کا تقرر امیر المومنین نہیں کریں گے؟ تو کیا اس صورت میں عدلیہ آزاد ہوگی یا امیر المومنین کے ماتحت؟

ملک میں فوجی آمر پرویز مشرف کے خلاف عدلیہ کی آزادی کے لئے چلنے والی تحریک کو جذبات کے جس طوفان کی شکل دی گئی اس سے خطرہ تھا کہ یہ حساس اور نہایت اہم مسئلہ بعض خطرناک مقاصد کے لئے استعمال ہوگا۔ کیونکہ اتنے بنیادی قومی معاملات پر جذبات کی بجائے غیر جذباتی غور و فکر، بحث و استدلال، عالمانہ نکتہ آفرینی کی ضرورت ہوتی

ہے۔ عدل مشکل ہو جاتا ہے جب آپ ایک شخص یا چند اشخاص کو اتنا تقدس دے دیں کہ وہ ہر طرح کے احتساب سے بالاتر ہو جائیں، یعنی جب یہ کہنا ناممکن ہو جائے کہ یہ ایک محترم شخص یا پانچ دس حضرات آخر ہم جیسے انسان ہیں، واجبی علم ودانش اور عام ماضی والے ہیں، کہ انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی آمر کے غیر قانونی اقدامات کی توثیق بھی کی تھی، اور اگر امریکہ کی طرح اعلیٰ عہدوں کے امیدواروں کا ذاتی ماضی بے نقاب کرنے کا قانون موجود ہو تو شاید کچھ باتیں قابل اعتراض بھی نکل آئیں، اس لئے اس شخص یا گروہ کو ملک وقوم کا مطلق العنان بادشاہ بنانا خطرناک ہوگا، کہ عدالت کے احترام کو شخصی اقتدار سے گڈمڈ نہ کرو۔

اقتدار واختیار تک پہنچنے کے لئے ایک آئینی قانونی راستہ موجود ہے، یعنی انتخابات جو ہر چار پانچ سال کے بعد کرائے جا سکتے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ قلم اور رقم کا سارا زور اس بات پر لگایا جائے کہ انتخابات کے ذریعے یعنی کروڑوں لوگوں کی رائے سے منتخب ہونے والی حکومت پر تو بدترین الزامات اور گالیوں کی بوچھاڑ کی جائے لیکن ایک دو درجن سرکاری ملازمین کو تعظیم وتقدس کے ایسے مقام کے لئے چن لیا جائے کہ وہ کسی بھی ملکی ادارے کو کوئی بھی حکم دے سکیں۔

چیف جسٹس صاحب کے لئے لامحدود اختیارات مانگنے والوں کے کچھ مخصوص مقاصد تھے جو وقت کے ساتھ واضح ہو رہے ہیں۔ جمہوریت کی تذلیل اور جمہوری حکومت کو گرانا ان کا فوری مقصد نظر آتا ہے، جبکہ اگلا قدم اور بھی بھیانک ہو سکتا ہے۔ شاید طوائف الملوکی اور طالبان کی امارات! القاعدہ اور طالبان کے یہ نمائندہ دانشور میڈیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ جامعہ حفصہ کے واقعات کے دوران ان چہروں کی شناخت واضح ہو گئی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ چیف جسٹس صاحب نے ایک آمر کے سامنے جھکنے سے انکار کیا، جو کہ آئین کے تحفظ کی ایسی مثال ہے کہ ایسے شخص پر پوری قوم کو مسلسل فخر اور اعتماد کرنا چاہیے، اور

اب آنے والے وقتوں میں چیف جسٹس صاحب سے کسی غلطی کا ارتکاب ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن ان قصیدوں کے ساتھ ہی عدالتِ عظمیٰ کو ایک ایکشن پلان بھی تجویز کر دیا جاتا ہے۔ شاید یہ ایک اتفاق ہے کہ عدالتِ عظمیٰ بار بار دہرائے جانے والے ان قصیدوں اور تبصروں کا ازخود نوٹس نہیں لے سکی جو عدالت پر اثر انداز ہونے کی کوشش کے زمرے میں آتے ہیں اور جرم ہیں۔

بے شک چیف جسٹس صاحب کا آمر کے سامنے استقلال بہت شاندار عمل ہے اور آئین کا دفاع کرنا ایک عظیم الشان کریڈٹ۔ لیکن اگر کسی شخص پر غیر مشروط اعتماد کے لئے اتنی بنیاد کافی ہے تو پھر ایسی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں اور کارکنوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ جنھوں نے ایک نہیں تین آمروں کو انکار کیا، متفقہ آئین بنانے کے لئے اور پھر اسے بحال کرنے کے لئے ساری قوم کو متحد کیا، پھر اس کے تحفظ کے لئے جانیں دیں، قلعوں کی اذیتیں، اور جلاوطنیاں قیدیں برداشت کیں، اور اس سارے عرصہ میں جب "آئین کے محافظوں" کی طرف سے تحسین کی بجائے مسلسل تذلیل آئی، تو اُسے صبر سے برداشت کیا۔۔ کیا آئین کی پاسداری اور آمر کا مقابلہ کرنے والے سیاسی کارکنوں کو بھی کچھ تقدس اور اعتماد دیا جانا چاہیے؟

Jurat-e-Tehqiq

علم کی ملکیت کا مبالغہ

مغالطے اور مبالغے کی ایک اور نمائندہ شکل وہ دعویٰ ہے جو آج کے ترقی یافتہ علوم کے بارے میں ہمارے اکثر علماء اور دانشوروں کے منہ سے سنا جاتا ہے۔ اقبال نے تو اتنا کہا:

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ علم کے یہ موتی کس عمل کے نتیجے میں یورپ جا پہنچے اور یہاں کیوں نہیں رہے۔ یہ دعویٰ عام ہوگیا کہ جدید دنیا کے علوم ہمارے آبا و اجداد نے ایجاد کیے، ''مغرب والے'' (جدید صنعتی معاشروں کو مغرب کہنے کا رواج اس وقت پڑا جب صنعت اور علم ابھی یورپ میں تھے۔ آج امریکہ، کینیڈا، روس، چین، جاپان، بھارت، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے علاوہ مشرق بعید کے کئی ملک صنعتی اور علمی دوڑ میں شامل ہو چکے ہیں لیکن جدید علوم کو ابھی تک مغرب کے نام کے ساتھ نتھی کرنے کا رواج ہمارے ہاں اسی طرح چل رہا ہے۔ جیسے انیسویں صدی میں شروع ہوا تھا) مغرب والے ہم سے سیکھ کر ہم پر چھا گئے ہیں، مغرب والے ہمارے آبا کے علوم چرا کر لے گئے، مغرب والوں نے ہمیں علم سے محروم کر دیا، مغرب والوں کی سازشوں کی وجہ سے ہم پیچھے رہ گئے اور وہ آگے نکل گئے۔ مغرب

والوں نے ہمیں تقسیم کر دیا اور سب سے دلچسپ یہ دعویٰ کہ جدید علوم گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہمیں صرف وہ علم حاصل کرنا چاہیے جو ہمارے مذہبی علما کی نظر میں صحیح ہے۔

ہم خود سے یہ سادہ سا سوال نہیں پوچھتے کہ ہمارے آباء نے فلسفہ، ریاضی، علم کیمیا، علم طبعیات، علم فلکیات اور علم طب یا علم تاریخ میں جو کام کیا وہ بعد کی نسلوں میں ہم نے کیوں نہیں سیکھا۔ ان علوم میں عرب اور دوسرے مسلم مفکرین کا کام نویں صدی عیسوی سے بارہویں صدی عیسوی کے آواخر تک سامنے آیا پھر رک کیوں گیا۔ اہل مغرب تو اٹھارہویں صدی سے پہلے دنیا کو بنانے بگاڑنے کی طاقت نہ رکھتے تھے، پھر تیرہویں صدی عیسوی کے آتے آتے کیا ہوا کہ ہم استادِ عالم کے رتبے سے اتر کر بکریاں چرانے لگ گئے۔ اگر دنیا نے ہمارے دادا کی یونیورسٹی سے تعلیم پائی تو ہمیں دادا کی یونیورسٹی میں داخلہ لینے سے کس نے روکا تھا جبکہ ہمارے بادشاہ دنیا کے اکثر علاقوں پر حکمران تھے اور 650ء سے 1750ء تک ہمیں روکنے والا کوئی نہ تھا۔

پھر ایسا کیوں ہے کہ ہمارے دادا سے علم حاصل کرنے والے لوگوں کا علم ہمیں گمراہی لگتا ہے۔ اور ایسا کیوں ہے کہ یہ مغرب جو ہمارے دادا کے علم کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتا ہمیں دشمن سمجھتا ہے یا ہم اسے دشمن سمجھتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مغرب نے ہماری سرزمینوں پر غلبہ حاصل کیا لہذا وہ مستقل دشمن قرار پایا۔ اگر دشمنی کا معیار یہی ہے تو پھر ان گنت واقعات ایسے بھی ہیں کہ مسلمانوں نے مسلمانوں کے علاقے فتح کیے اور ان پر حکومتیں قائم کیں۔ مسلمان ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہے ہیں۔ تو کیا یہ دشمنی کی مستقل بنیاد ہے اور کیا علم سے نفرت کی یہ وجہ کافی ہے کہ علم والے نے ہمارے اوپر حکومت کی ہے۔

حقیقت اس کڑوے سچ میں ہے کہ خود ہمارے محترم دینی بزرگوں نے ان عظیم الشان مسلم سائنسدانوں اور مفکروں کو کام کرنے سے روک دیا۔ جن کے سنے سنائے

ناموں کو دہرا کر ہم فخر سے گال پھلا لیتے ہیں۔ان مفکروں میں الفارابی، الخوارزمی، البیرونی، ابن سینا، عمر خیام، ابن حسن بن حیثم (جو جدید آپٹکس اور کیمرہ کے بابا آدم ہیں)، جابر بن حیان، ابن عربی، ابن رشد، کندی اور کتنے ہی اور شاندار لوگ جنہوں نے جدید سائنس، علم فلکیات، ریاضی، فلسفہ اور طب میں اپنے پیش رو یونانیوں اور اہل ہند سے سیکھا اور پھر ان علوم کو نئی بلندیاں عطا کیں۔جن سے اہل یورپ نے سیکھا اور بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ یورپ میں تحریک احیائے علوم (Renaissance) ان اساتذہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔لیکن ان اساتذہ میں سے شاید ہی کوئی ایسا بچا ہو جسے کفر کے فتووں، دھمکیوں اور جسمانی اذیتوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔اس دردناک صداقت سے کم لوگ واقف ہیں کہ ان میں سے بہت سے لوگوں کی بیش قیمت کتابیں دینی علما کے فتووں کی روشنی میں جلا دی گئیں اور تیرہویں صدی عیسوی کے آتے آتے یہ عظیم علمی روایت بنیاد پرستی کے ڈھیر تلے دب کر خاک ہوگئی۔الفارابی 870ء عیسوی میں پیدا ہوا اور ابن رشد 1198ء میں فوت ہوا۔لیکن علم کا سفر پہلے ہی رک چکا تھا۔ہلاکو نے 1256ء میں بغداد پر حملہ کر کے اس رکی ہوئی تہذیب کو سزا دے دی۔جب فکری آزادیاں سلب کی جاتی ہیں تو پھر قوموں کو اس کی سزا ملتی ہے اور ترقی سے تنزل کا سفر برق رفتاری سے طے ہوتا ہے۔

اندلس میں مسلم حکومت کے سبب ان شاندار علوم کے کچھ حصے یورپ کے علم دوستوں تک پہنچ چکے تھے۔جسے ارتقائے انسانی کا ذریعہ بننے والے اہل فکر نے اس وقت بھی سینے سے لگائے رکھا جب اندلس میں مسلم تہذیب کے نقوش مٹانے کے لئے عیسائی انتہا پسند، مسلمانوں کے علم کو کفر کا درجہ دے کر جلا رہے تھے۔ادھر بغداد میں ان علوم کی جو شکلیں بچ گئی تھیں، وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔چنانچہ ہلاکو نے 1256ء میں جب بغداد کو تاراج کیا تو بغداد کی مساجد اور گلیوں میں اس قسم کے موضوعات پر مناظرے ہوتے تھے کہ ''

الضالین'' میں ''ض'' کی ادائیگی کرتے وقت زبان کس پوزیشن میں رکھنا شرعاً درست ہے۔اور کہتے ہیں کہ ان مناظروں کے بعد مسلم عوام گلیوں میں دیر تک تلواروں سے لڑتے نظر آتے تھے۔معلوم نہیں اس میں کتنا مبالغہ ہے لیکن یہ بہرحال سچ ہے کہ مسلم امہ کو اپنے علوم سے کسی غیر نے نہیں اس کے اپنے دینی بزرگوں نے الگ کیا۔

علم کے ساتھ ہونے والا یہ سلوک وسطی زمانوں تک ہی محدود نہیں۔زمانے بدلے تو پھر مسلمانوں کے ہاں روشن ذہن ابھرے لیکن ہر ایک کے ساتھ وہی سلوک ہوا جو وسطی زمانوں کے ان شاندار ذہنوں کے ساتھ ہوا تھا۔جدید دور میں گرچہ سائنس کے خالص علمی مضامین میں ریسرچ اور ایجاد کے میدان میں ہمارے ہاں بہت کم کام ہوا ہے تاہم علم و سیاست میں بہت سے شاندار رہنما پیدا ہوئے۔لیکن یہ سب مثلاً سرسید احمد خان، محمد علی جناح، کمال اتاترک، مصدق، بن باللہ، ناصر، سکارنو، ذوالفقار علی بھٹو، فیض اور ڈاکٹر عبدالسلام فتووں اور نفرتوں کی زد میں رہے اور کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی انداز میں انہیں اپنا کام ادھورا چھوڑنا پڑا یا ایسے سمجھوتے کرنے پڑے جن سے ان کے کام کی شکل ہی بدل گئی۔

تاریخ عالم کا ایک سبق یہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں فیصلہ کن رول انسانی وسائل کا ہوتا ہے۔انسانی وسائل کی نشوونما اور معاشرے میں اس کا عمل دخل اگر صحیح رستوں پر چل نکلے تو معاشرے سنور جاتے ہیں، نہیں تو برباد ہو جاتے ہیں۔فوجی اعتبار سے تاتاریوں نے دنیا کو جس رفتار سے تسخیر کیا وہ مسلمانوں سے کہیں تیز تھی۔لیکن انسانی وسائل کی جو نشوونما مسلم فاتحین کی پشت پر تھی وہاں نہ تھی تو فرق دیکھیں: مسلمانوں نے صدیوں پر محیط حکومت کی جبکہ تاتاری آئے اور گئے۔وہ بغداد کو لوٹ کر بھی قائم نہ رہ سکے جبکہ مسلم معاشرہ لٹ کر بھی آباد رہا۔ یہ تاریخ کا بار بار دہرایا ہوا سبق ہے کہ وحشی اور کم علم اور جمود کا شکار فاتح یا حملہ آور کسی بستی کو تاراج تو کر سکتا ہے لیکن انسانوں کی اس بستی کا بادشاہ نہیں بن سکتا۔شیر اپنی ساری طاقت کے

باوجود آبادی کے چند آدمی یا چند جانور مار کر بھی جنگل کا بادشاہ ہی رہتا ہے۔ اگر مسلمانوں نے اپنے سائنسدانوں اور مفکروں سے فائدہ اٹھایا ہوتا تو شائد آج تاریخ کچھ اور ہوتی۔

انسانی وسائل سے کیا مراد ہے؟ انسانی وسائل اس استعداد کو کہتے ہیں جو افراد کو علم اور تجربہ سے حاصل ہوتی ہے اور معاشرہ کی اجتماعی زندگی کے کام آتی ہے۔ تجسس انسان کی فطرت کا بنیادی جوہر ہے۔ تجسس تحقیق اور سوال کو جنم دیتا ہے۔ تحقیق اور سوال نئے نتائج تک لے جاتے ہیں۔ اگر رکاوٹیں نہ ہوں تو نئے مفروضوں اور نتائج کو عملی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے اور یوں غلطیوں کا تجزیہ کرتے اور غلطیوں کی اصلاح کرتے ہوئے انسانی ذہن تسخیر اور تعمیر کے مرحلے طے کرتا ہے۔ کوئی علم اس وقت تک سچا علم نہیں بنتا جب تک اس کے دعوے عمل میں ثابت نہ ہو جائیں۔ یہ علم انسانی زندگی کے ہر طرح کے معاملات میں ترقی کرتا ہے جس میں معاشرت سے لے کر ماحولیات اور کائنات کے علوم تک سب کچھ شامل ہے۔

جب کسی معاشرے کے افراد ایسا علم اور ایسی استعداد حاصل کر لیتے ہیں جو وقت کے اعلیٰ ترین معیاروں پر پورا اترتی ہو اور نشوونما کی صلاحیت رکھتی ہو، وقت اور زندگی کے نئے نئے ابھرنے والے سوالوں اور ضرورتوں کا حل تلاش کرنے کی قوت رکھتی ہو تو اسے انسانی وسائل کی اعلیٰ سطح کہا جاتا ہے۔

طاقتور معاشرے اپنی زندگی کے ہر شعبے میں ایسے شاندار افراد پیدا کرتے ہیں جو اس اعلیٰ ترین ذہنی صلاحیت کے مالک ہوں۔ سیاسیات سے لے کر مجرد علوم تک، فلسفہ سے لے کر ٹیکنالوجی تک، سماجی زندگی سے متعلق ہر شعبہ میں اعلیٰ معیار کا حصول صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ افراد اپنے کام کو ہر دوسرے معاملہ پر فوقیت دیتے ہوں یعنی مکمل یکسوئی اور اعتماد سے اس دھن میں لگے ہوں کہ انہیں دریافت اور ایجاد کی طرف جانا ہے اور انہیں اس عمل میں معاشرے کا تعاون اور احترام نصیب ہو۔ پھر دریافت اور ایجاد کے کچھ اور تقاضے

ہیں۔ اس کے لئے آزادیِ فکر اور آزادیِ استدلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ گھٹن اور پابندی اور طے شدہ ضابطوں کی اطاعت انسانی فکر کو ایجاد کی راہ پر جانے ہی نہیں دیتی۔ مسلم مفکروں اور دانشوروں کو ایجاد کی راہ سے اسی پابندی نے روک دیا جس کا موقف یہ تھا کہ آزادیِ استدلال کی اجازت اسلام میں موجود نہیں اور یہ کہ اختلاف شیطان کی پیروی ہے جبکہ مندرجہ بالا اہل فکر کا استدلال یہ تھا کہ علم کے رستے میں اگر عقائد روکاوٹ بنتے ہیں تو عقائد کو بدلنا چاہیے نہ کہ علم کو، کیونکہ عقائد کے پاس اپنی صحت کا اگر کوئی ثبوت موجود نہیں اور علم کے پاس موجود ہے تو پھر علم کیوں سمجھوتہ کرے۔ نتیجتاً اہل علم کو اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ مسلم معاشرہ میں مذہبی راہنماؤں کے پاس مذہبی جذبات کی وہ تلوار ہے جس سے سب کچھ کاٹا جا سکتا ہے۔

وسطی زمانوں میں مسلم اہل علم جب یونان کے علوم سے باخبر ہوئے تو انہیں محسوس ہوا کہ منطق اور فلسفہ سے لے کر معاشرت اور سیاست تک ہر طرح کے افکار کو دلیل کی کسوٹی پر پرکھنا اور عملی ٹیسٹ سے گزارنا ضروری ہے۔ عباسی دور میں فکر و نظر کی تھوڑی سی آزادی نے انہیں مختلف میدانوں میں اپنے وقت کے بہترین معیاروں تک پہنچا دیا۔ پھر علمائے دین نے یہ عمل روک دیا۔۔ اسی طرح جدید دور کے وہ شاندار ذہن جن کا ذکر اوپر کیا گیا وہ بھی وقت کے بہترین علمی ذرائع سے تربیت پا کر تخلیقی طرزِ فکر کے مالک بنے۔ انہوں نے اپنی قوموں اور اپنے گردوپیش کی راہنمائی کے لئے جو پروگرام دیئے ان کی صحت اور طاقت کا اندازہ نتائج سے لگایا جا سکتا ہے مثلاً نوآبادیاتی نظام سے آزادی کے لئے مسلم معاشروں نے جو کامیابیاں حاصل کیں وہ سب کی سب جدید افکار رکھنے والے مسلمان راہنماؤں کا کارنامہ ہے۔ کمال اتاترک، محمد علی جناح، مصدق، سکارنو، بن باالله، جمال عبدالناصر اور ذوالفقار علی بھٹو اسی طرزِ نو کے نمائندے تھے۔ لیکن مسلم معاشروں کو مسلم اُمہ کہنے والے ایک گروہ نے بار بار مسلمانوں کے انسانی وسائل کو درہم برہم کیا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو نہ تو مسلمانوں کو مسلم امہ بنا

سکا ہے نہ ہی ان کو اپنے اپنے علاقائی تشخص میں قبول کرتا ہے۔

دنیا میں نوآبادیاتی نظام اپنے جدید ترین انسانی وسائل اور علوم کے ساتھ دنیا پر حاوی ہوا تو ہمارا یہ طبقہ اس نظام کے خلاف کچھ نہ کر سکا کیونکہ وقت سے پیچھے تھا، انسانی وسائل کی سطح پر پسماندہ تھا۔ یہ طبقہ جس نے اپنے بدنصیب مسلم معاشروں کو بادشاہوں کی مدد سے جکڑ رکھا تھا، نئی استعماری طاقتوں کے آگے ریت کا ڈھیر ثابت ہوا۔ (آج اس طرز فکر کے حامی تصادمی عناصر موثر یا منظم دکھائی دیتے ہیں، تو اس کی وجہ وہ سامراجی کھیل ہے جس نے انہیں اپنا مہرہ بنا کر روس کے خلاف استعمال کیا، جبکہ یہ تنظیم اور اثر انگیزی صرف منفی ہے، مسلمانوں کے لئے اس کا کوئی مثبت رول نہیں اور جس وقت یہ سامراجی ہاتھ جو کبھی امریکی تھا اور اب عربی یا روسی ہے، ان کے پیچھے سے ہٹ جائے گا تو سب دیکھیں گے کہ یہ تخریب میں بھی کتنے موثر ہیں)۔ برصغیر میں 1857 سے لے کر تحریک خلافت تک اس طبقہ کی تحریکوں کا حال سب کے سامنے ہے۔ پھر جب مسلم دنیا میں جدید طرز فکر اور طرزِ سیاست لے کر مسلم قوم کے نئے دماغ ابھرے تو سب نے دیکھا کہ اس طبقہ کی ساری مخالفت کے باوجود نوآبادیاتی نظام سے آزادی کا عمل آگے بڑھا۔

آزادی کا یہ عمل یکسوئی سے آگے بڑھتا تو آج مسلم اقوام اپنی اپنی سرزمینوں میں اقوام عالم کے شانہ بشانہ کھڑی ہوتیں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ آج جس طاقتور شکنجے میں مسلم اقوام جکڑی ہوئی ہیں اس نے ان کی سابقہ ایک صدی کی جدوجہد کو خاک میں ملا دیا ہے۔ دین اور امہ کے نام پر مسلم نیشنل ازم کے رہنماؤں کو بدنام کر کے ان کی تحریکوں کو ندامت اور معذرت میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ نیشنل ازم کی تحریکیں اپنی کرپشن اور بے راہ روی کی وجہ سے ناکام ہو گئیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلم اقوام کے متحرک سیاسی عناصر کو اس گٹھ جوڑ نے بے بس کر دیا

جو عالمی سرمایہ اور عرب شیوخ کے درمیان قائم ہوا، جس نے مذہبی تحریکوں کی تلوار سے قومی تحریکوں کو کاٹ دیا۔ مذہبی جماعتوں نے بے مقصد نفرتوں اور تصادمی سیاست کو رواج دیا اور جدید علوم اور آزادی فکر کو گالی بنا دیا گیا۔

امریکہ کے کارپوریٹ طبقہ اور مسلمانوں کے ''جہادی محاذ'' میں بظاہر تصادم کے چرچے ہیں، جس نے مسلم عوام کو بے حد متاثر کیا ہے، کیونکہ تصادم پیدا کرنے والے منصوبہ ساز جانتے ہیں کہ مسلم عوام کی جذباتی کیفیت کیا ہے۔ لیکن اس تصادم سے پیدا ہونے والے نتائج کا تجزیہ کریں تو یہ راز کھل جاتا ہے کہ یہ تصادم نہیں بلکہ کارپوریٹ امریکی مفادات کے تحفظ کا منصوبہ ہے جس نے مسلم اقوام کو اپنے مسائل سے ہٹا کر ایک ایسے راستے پر ڈال دیا ہے جس کی کوئی منزل نہیں۔ کوئی منزل اس لئے نہیں کہ اس تحریک نے دفاع کی بجائے غلبہ اسلام کا نعرہ بلند کیا ہے اور جارح فوجوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے سول آبادیوں پر حملوں کا اصول اپنایا ہے جس کا نتیجہ سوائے فساد اور بدنامی کے کچھ نہیں۔

مسلم اقوام کی پچھلی ایک صدی کی جدوجہد آج ایک منتشر ماضی کی حالت میں ہے۔ حتیٰ کہ حالت یہاں پہنچی ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل انسانی وسائل کی دوڑ سے رضا کارانہ طور پر الگ ہوگئی ہے یہ کہہ کر کہ ہمارا نصب العین دعوت اسلامی کو پھیلانا اور غلبۂ اسلام کے لئے جہاد کرنا ہے اور یہ کہ جدید علوم ہمیں دنیا اور اس کے معاملات سے محبت سکھاتے ہیں جو کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد نہیں، کیونکہ مسلمان کی زندگی کا مقصد اسلام کو پھیلانا اور آخرت کی تیاری کرنا ہے۔ جو چند افراد اس دوڑ میں رہ گئے ہیں وہ ترقی یافتہ اقوام کی شہریت اختیار کر رہے ہیں یا وہاں ملازمتیں ڈھونڈ رہے ہیں یا اپنے وطنوں میں بے سمتی کا شکار ہو گئے ہیں، کیونکہ ان کے تخلیقی عشق کو سراہنے والا کوئی نہیں۔

علم کی ملکیت اور علم کی تعریف کے مغالطے کیا کیا ہیں اور کیسے کیسے ان مغالطوں نے

مسلم ذہن کو متاثر کیا ہے، کیسے دین کے نام پر دنیا کے معاملات کو شرمسار کر دیا گیا ہے، مکمل ضابطہ حیات کے تصور کو مبالغے کی یہ شکل کیسے دے دی گئی ہے کہ اب قرآن اور حدیث زبانی یاد کر لینے والا شخص خود کو نظام ہستی کا استاد سمجھتا ہے، یہ ایک الگ کتاب کے موضوعات ہیں۔ یہاں صرف اتنا کہنا ممکن ہے کہ اس مبالغہ اور مغالطہ سے ایک کرخت اور متکبر مذہبی طبقے نے اپنی بالادستی کا رستہ ہموار کیا ہے۔

Jurat-e-Tehqiq

نگران جماعت کا مغالطہ

یہ خود ایک بڑا مغالطہ ہے کہ دین میں کسی خود ساختہ مذہبی نگران کا کوئی جواز ہے، یا اس کی قانونی حیثیت ہے؟ قرآن میں یہ مسئلہ یوں بیان ہوا ہے۔

ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اُولیک ھم المفلحون o 3:104 (اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور بُرے کاموں سے روکے۔ یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔)

جب دین مکمل ہوا تو رسول اللہ ﷺ اسلامی ریاست کے سربراہ تھے صحابہ کرام کی ایک جماعت موجود تھی اور ہمہ وقت تحریک کی کامیابی کے لئے مستعد تھی تو ظاہر ہے کہ یہ تجویز آنے والے وقت کے لئے ہی تھی جبکہ ابھی اسلامی ریاست کے انتظام و انصرام کے لئے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ یا نائب کا تقرر بھی نہیں ہوا تھا نہ ہی اس کے لئے کسی طریقہ کار کا تعین ہوا تھا۔ لہٰذا اس آیت کا اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ سربراہ ریاست کے تقرر کے بغیر ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو اسلام کے احکام پر عملدرآمد کروائے، تو یہ قرین قیاس نہیں کیونکہ اگر یہ محض ترغیب و نصیحت کرنے والے ہوں گے تو ایک حکومت کی حمایت کے بغیر ان کی حیثیت صرف تبلیغ کی ہوگی، روکنے یا حکم دینے کی نہیں۔ اور اگر یہ قوت کا استعمال کریں گے اور نفاذِ شریعت کے لئے کوشاں ہوں گے تو صورتحال وہی ہوگی جو جامعہ حفصہ اور طالبان کی

نفاذِ شریعت مہم سے پیدا ہوئی یعنی حکومت وقت سے تصادم اور تباہی۔

تو پھر تجویز کردہ جماعت کی دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں جس میں یہ موثر ہو سکتی ہے۔ اول یہ کہ حکومتِ وقت ہی وہ ادارہ ہو جو رسول اللہ ﷺ کے بعد اوامر و نواحی کے نفاذ کی مکمل ذمہ داری نبھائے یعنی سربراہِ مملکت اور پارلیمان وغیرہ۔ یا دوم یہ کہ خلافت و امامت کا ادارہ قائم ہونے کے بعد حکومت کی نگرانی میں ایک الگ ادارہ ترغیب و نفاذ کا ہو، جیسے بیشتر منظم معاشروں میں قدیم زمانوں سے آج تک قانون کی عملداری کے لئے ایک نہ ایک ادارہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک نظریاتی معاشرے میں یہ ادارہ پولیس کی طرح کا ہوگا لیکن اس لحاظ سے مختلف بھی ہوگا کہ یہ تربیت بھی کرے گا، ترغیب بھی اور نفاذ بھی۔ اس کے فرائض کی عملی شکل جو بھی ہو یعنی محض تعلیم و ترغیب ہو یا نفاذ کی ذمہ داری بھی اس کی ہو، بہرصورت یہ ادارہ ریاست کے مرکزی انتظام کے ماتحت ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے تقرر کا سوال بھی اسلامی ریاست کے مرکز کے ساتھ مشروط ہوگا یعنی چاہے یہ اعزازی ادارہ ہو یا تنخواہ دار اس کا تقرر مرکز ہی کرے گا۔ چنانچہ مدنی دور میں ایسی تقرری کا آغاز ہوا۔

مسلمان بادشاہتوں میں بھی مرکزی حکومت کے جاری کردہ خطبے پڑھنے والے آئمہ مساجد کا سلسلہ جاری رہا۔ جب خلافت کے خاتمے کے بعد مسلم شاہی حکومت بھی ختم ہو گئی تو ایک عرصے تک مسلم معاشروں میں مقامی آبادیوں کے چوہدری، سردار اور وڈیرے مقامی سطح پر مولوی حضرات کو ذاتی اور مقامی ملازمین کی حیثیت سے مقرر کرتے رہے اور ان لوگوں کا رول بادشاہ کا خطبہ پڑھنے والے آئمہ مساجد ہی جیسا تھا یعنی یہ حاکم کے خلاف کچھ نہیں کہتے تھے، جس میں ہزار میں شائد ایک ایسا ہوتا ہوگا جو مقامی رئیس سے اختلاف کرتا اور اس کی بے اعتدالیوں یا چیرہ دستیوں کے آگے سینہ سپر ہوتا ہوگا۔ تاہم اس کی کوئی روایت قابل ذکر نہیں۔ مسلم شاہی سلطنت کی تاریخ میں انفرادی مثالیں آئمہ کرام کی بے شک موجود ہیں کہ جنہوں نے امّوی، عباسی اور عثمانی ادوار میں یا برصغیر کے مسلم بادشاہوں کے دور

میں بادشاہوں سے اختلاف کیا، شاہی عتاب سہنے کی چند مثالیں بھی ہماری تاریخ کا حسن ہیں مگر کاش یہ کچھ زیادہ ہوتیں اور کچھ زیادہ موثر ہوتیں۔ بہرحال جو کچھ تاریخ میں ہے وہ اس جماعت کی شکل نہیں جس کا ذکر متذکرہ آیت میں ہوا ہے یا جو مفہوم اس وقت نافذ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

دین کے نام پر ازخود مقرر ہو جانے والے نگران علما کا ظہور واضح طور پر اس وقت سے ہوا جب برصغیر میں انگریز کا راج مستحکم ہو گیا تاہم نو آبادیاتی حکومت کے آخری دور تک اس طبقے کا رول انگریز سے بغاوت کا نہیں رہا بلکہ مغلیہ سلطنت کی بحالی کے لئے دعا کرنے تک محدود تھا جسے وہ اسلامی حکومت کہتے تھے۔ جن مذہبی علما نے انگریز کی جیلیں کاٹیں، انھوں نے مسلح جدوجہد اور خودکش حملے نہیں کیے۔

اسلام کے دینی رہنماؤں کو بادشاہوں سے جو محبت تھی، وہ حضرت شاہ ولی اللہ کی ان کوششوں تک محدود نہیں جو انہوں نے مغلیہ سلطنت کی بحالی کے لئے کیں۔ اس کی ایک شکل اسی دور میں کہیں اور بھی چل رہی تھی۔ سعودی عرب میں شیخ عبدالوہاب نے ایک نئی عرب سلطنت کا خواب دیکھا جو عثمانی ترکوں کی خلافت سے الگ ہو کر عربوں کی عظمت کو بحال کرے۔ شیخ عبدالوہاب جن کے نام سے وہابی تحریک کو جانا جاتا ہے دراصل ایک ایسی عربی بنیاد پرستی کے علم بردار تھے جس نے بالآخر اخوان المسلمون اور موجودہ القائدہ کی شکل اختیار کی۔ لیکن شیخ عبدالوہاب نے اپنی زندگی میں جو کارنامہ سرانجام دیا وہ محمد السعود کی بادشاہت قائم کرنے کا تھا۔ جس کی مختصر تاریخ یوں ہے۔

1744ء میں شیخ عبدالوہاب اور قبائلی سردار ابن سعود کے درمیان معاہدہ ہوا کہ وہ شیخ کے مذہبی نظریات کو اور شیخ اس کے تاج وتخت کو طاقت دیں گے۔ 1765ء تک شاہ ابن سعود اور وہابی افراد نے نجد کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرلیا۔

1765ء میں ابن سعود نے وفات پائی تو اس کے فرزند عبدالعزیز نے پیش قدمی

جاری رکھی۔

1792ء میں شیخ عبدالوہاب نے وفات پائی لیکن ان کے پیروکار یعنی الاخوان شاہ عبدالعزیز کی افواج کی حیثیت سے سرگرم رہے۔

1801ء میں وہابی افواج نے کربلا میں حضرت، حسینؓ کا مزار تباہ کر دیا جو مشرقی عراق میں واقع ہے۔ جس سے اسلامی دنیا میں موجودہ تقسیم اور نفرت کی بنیاد اور گہری ہوئی اور دو واضح مرکز یعنی ایران اور سعودی عرب نمودار ہوئے۔ یاد رہے کہ یہ دور عرب دنیا میں انگریز کی موجودگی کا دور ہے اور انگریز کی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی اسی دور میں مشہور ہوئی۔

1802ء میں عبدالعزیز بھی فوت ہو گیا اور اس کی جگہ سعود بادشاہ بن گیا لیکن وہابی افواج بدستور اس کی وفادار رہیں۔

1803ء میں عبدالعزیز کی افواج نے حجاز کے شہروں پر قبضہ کر لیا، جن کی کمان شاہ عبدالعزیز کا بیٹا سعود کر رہا تھا۔ خلافت عثمانیہ نے اپنی کمزوری کے پیش نظر مصر کے نیم خود مختار کمانڈر محمد علی کو سعودی فوجوں کی سرکوبی کے لئے مقرر کیا۔ اس دور میں عثمانی خلیفہ انگریزوں کی حکومت کا حلیف تھا۔

1816ء میں سعودی فوجوں اور محمد علی کی افواج کے درمیان لڑائی ہوئی جن کی کمان سعود کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ کر رہا تھا۔

1818ء میں عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز بن سعود جس کی طاقت سمٹتے سمٹتے الدریہ تک رہ گئی تھی، محمد علی کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ محمد علی نے عبداللہ بن سعود کی وہابی افواج کو درہم برہم کر دیا اور عبداللہ اس سرزمین کو چھوڑ کر جلا وطنی میں چلا گیا۔ ان واقعات سے وہابی افواج کی اصل طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بے طاقت خلیفہ کے مقامی کمانڈر کی فوج نے اس ستر سالہ تحریک کو شکست دے دی۔

1890ء میں جلا وطن بادشاہ عبداللہ کے فرزند عبدالعزیز نے جلا وطنی سے واپس آ

کرالاخوان کی کٹر وہابی فوجی قوت کو ساتھ لے کر پھر جدید سعودی سلطنت کی مرحلہ وار بنیاد رکھی۔ اسے انگریزوں کی آشیر باد بدستور حاصل تھی۔

1905ء۔۔۔ چنانچہ عراق کے عثمانی گورنر نے عبدالعزیز کو نجد کے لئے عثمانی خلیفہ کا نمائندہ تسلیم کرلیا۔ عثمانی خلیفہ ابھی تک انگریزوں کا حلیف تھا۔

1913ء میں عثمانی خلیفہ اور انگریزوں کے درمیان اختلافات سامنے آنے شروع ہو گئے۔ اسی سال عبدالعزیز نے عثمانی خلیفہ کی فوجوں کو مشرقی عرب سے نکال دیا۔ اس وقت عثمانی خلیفہ اور جرمنی کے درمیان تعلقات بڑھ رہے تھے جس کا مشورہ اس کے دربار میں ابھرنے والے بعض نوجوان انقلابی ترکوں کا تھا اور انگریزوں کو اس کا رنج تھا۔

تقریباً اسی دوران الاخوان تحریک عرب بدوؤں میں زور پکڑ رہی تھی اور یہ بدو لوگ اپنی صحرائی زندگی چھوڑ کر ہجرہ نام کی زرعی بستیاں بنا رہے تھے۔ 1915ء تک سخت گیر شریعت کے یہ حامی عناصر ایک لاکھ کے لگ بھگ ہو چکے تھے اور یہ عبدالعزیز کے ساتھ لگ کر اسلام پھیلانے کے لئے بے چین تھے۔ لیکن انگریزوں کے مقاصد ابھی کچھ اور تھے اور انہوں نے کچھ عرصہ عبدالعزیز کو اردن شام اور عراق کے صحراؤں سے آگے آنے سے منع کر رکھا تھا۔

یہ حقیقت اکثر بھلا دی جاتی ہے کہ تحریکیں چلانے والے جن خفیہ مقاصد کے لئے تحریکیں شروع کرتے ہیں، زیادہ دیر تک تحریک کے کارکنوں کو اور عوام کو ان خفیہ مقاصد کے ماتحت نہیں رکھ سکتے اور یہ جوشیلے متحرک لوگ جو شاندار نعروں کی وجہ سے متحرک ہوتے ہیں خود اپنی قیادت کے لئے عذاب بن جاتے ہیں۔ جس کا ایک حالیہ مظاہرہ جامعہ حفصہ میں ہوا ہے اور القائدہ کی تحریک کے مختلف متحرک عناصر کی سرگرمیوں میں ہو رہا ہے۔

1919ء میں االاخوان نے شریف مکہ کی فوجوں کو مکمل تباہ کر دیا۔ شریف مکہ سے انگریز نے عثمانی خلیفہ کو حجاز سے بے دخل کرانے کا کام لیا تھا اور وہ ابھی شریف مکہ کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن شریف مکہ خلیفہ بننے کا دعویدار تھا۔ چنانچہ شریف مکہ کی فوجوں کی مکمل

تباہی کے باوجود انگریز کی مداخلت سے الاخوان مکہ پر قبضہ سے باز رہے۔

1924ء میں عبدالعزیز نے حجاز پر قبضہ کر کے شریف مکہ کو ختم کر دیا اور محافظ حرمین شریفین کا لقب اختیار کیا لیکن اب اسے اخوان کی انتہا پسندی کا سامنا تھا جو جدید زمانے کے آلات کے مخالف تھے انگریز کے وفادار سعودی بادشاہ اور اس کی حربی قوت یعنی الاخوان میں تضاد شدید ہو چکا تھا۔

1919ء سے 1924ء تک برصغیر ہند میں تحریک خلافت چل رہی تھی اور یہ تحریک 1924ء میں اس وقت ختم ہوگئی جب کمال اتاترک نے عثمانی خلیفہ کی خلافت کو اور خلافت کے ادارہ کو باضابطہ طور پر ختم کر دیا۔ اب ایک نئی خلافت یا اسلامی مرکز کی ضرورت پیدا ہو چکی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ تحریک خلافت یعنی عثمانی خلیفہ کو قائم رکھنے کی تحریک انگریز کی آشیر باد سے چلائی جا رہی تھی جس کا مقصد عثمانی خلافت کو بچانا نہیں بلکہ ترکوں کی جدید قومی تحریک کے خلاف مسلمانوں میں نفرت پیدا کرنا اور مذہبی جذبات ابھارنا تھا۔ اسی دور میں جمال الدین افغانی اور لارنس آف عریبیہ کی سرگرمیوں نے شہرت پائی۔

1929ء میں عبدالعزیز نے الاخوان کو اپنے قبائلی حمایتوں اور انگریز کی تائید سے شکست دے دی اور ان کی طاقت کو منتشر کر دیا۔ اس کے باوجود ان کا اثر اتنا گہرا تھا کہ عبدالعزیز کو ریڈیو اسٹیشن کے قیام کے لئے سعودی عرب کے علما سے لڑائی لڑنا پڑی جو جدید آلات کے سخت مخالف تھے اور کہتے تھے کہ چونکہ یہ آلات رسول اللہ ﷺ کے دور میں نہیں تھے اس لئے حرام ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ اس وقت مطمئن ہوئے جب شاہ عبدالعزیز نے ریڈیو سے قرآن نشر کروا کر ان بزرگوں کو سنوایا۔

1930ء تک سعودی عرب کی مالی حالت بہت پتلی تھی کیونکہ کساد بازاری کے اس لمبے دور میں حاجیوں کی تعداد بہت کم تھی لہذا سعودی قبائل کو روٹی مہیا کرنے کے لئے شاہ عبدالعزیز کو انگریز حکومت سے مالی مدد لینا پڑتی تھی۔ 1930ء میں انگریزوں نے تیل

نکال لیا جو انگریزوں اور شاہی خاندان کی مشترکہ دولت بنا۔

اس تاریخ کے بیان سے مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ خلافت کے خاتمہ اور نئی خلافت کے قیام کے دوران ہمارے مذہبی طبقوں کی جدوجہد کا اصل حال کیا تھا اور اس کے نتائج کیا نکلے ہیں۔

برصغیر میں نفاذ دین کی کوئی قابل ذکر تحریک انگریز کے دور میں نہیں ابھری جس کا تعلق حکومت سے ٹکرانے یا لوگوں پر اپنی رائے مسلط کرنے سے ہو۔ سلطنت برطانیہ میں مسلمانوں کے لئے قانون شریعت کا مطالبہ اپنی جگہ لیکن ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ علما کی کسی تحریک نے حدود آرڈیننس یا قانون ارتداد کے نفاذ کی تحریک چلائی ہو یا ٹارگٹ کلنگ یا خودکش حملوں کا راستہ اپنایا ہو۔ خود روتشدد یا انتقام کے جذبات جو انتہاپسند دشمنوں کے خلاف انفرادی سطح پر پیدا ہوئے ایک الگ معاملہ ہیں۔ غازی علم الدین شہید کسی منظم گروہ یا تحریک کا حصہ نہیں۔ کسی مدرسہ نے انگریز حکومت کے دائرہ کار میں اپنا کوئی فیصلہ نافذ نہیں کیا۔ برطانوی قانون میں ارتداد کی سزا موت نہ تھی۔ بہت سے مسلم مفکرین نے روایتی اسلامی تصورات سے جو اختلاف کیا اس کے خلاف مذہبی عناصر نے فتووں سے بڑھ کر کوئی کارروائی نہیں کی۔ چنانچہ علمائے کرام نے ارتداد کی سزا موت کی کوئی قابل ذکر کوشش بھی نہیں کی۔ حتیٰ کہ مرزا غلام احمد نے قادیان میں نبوت کا دعوی کیا اور دیر تک زندہ رہ کر اور بہت سے مناظروں میں حصہ لے کر فطری موت پائی، اس کے خلاف کوئی خودکش بمبار یا فدائی تیار نہیں ہوا کہ شائد اس سے انگریز کی حکومت کو پریشانی ہوتی۔ لہٰذا یہ سب نیکیاں پاکستان کے لئے اٹھا رکھی گئیں۔

اگرچہ پاکستان کی تحریک کو برصغیر کی دو اہم اسلامی جماعتوں نے سختی سے مسترد کر دیا تھا اور ڈٹ کر اس کی مخالفت کی تھی لیکن پاکستان بنتے ہی جماعت اسلامی اور جمعیت علماء ہند کے وہ راہنما جو پاکستان کے لئے نامزد کیے گئے تھے، پاکستان تشریف لے آئے۔ قائداعظم محمد علی جناح کو ان حضرات کی سخت ترین نفرت کا سامنا متحدہ ہندوستان میں بھی تھا۔ اور پاکستان میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ دین کے محافظوں کا استدلال یہ تھا کہ چونکہ جناحؒ کی جماعت نے

اسلام کا نام لیا ہے اور اسلام تو ہماری فکری ملکیت (Intellectual Property) ہے۔ لہذا ہم اس کی حفاظت کے لئے آ گئے ہیں کہ کوئی اسے استعمال نہ کر سکے (یہ الگ بات کہ جمعیت علماء ہند کانگرس کا دایاں بازو بن کر رہی اور کانگرس کے بنائے ہوئے موجودہ سیکولر آئین میں انہیں اسلام کی تباہی کا کوئی سامان دکھائی نہیں دیا)۔

جماعت اسلامی کو قائداعظم کی ذات کے باعث جو دقتیں تھیں جلد ہی قائداعظم کی موت سے وہ دقتیں دور ہو گئیں۔ پاکستان روائتی جاگیرداروں کی قیادت میں آ گیا، اب جماعت اسلامی کے لئے میدان تیار تھا۔ دوسری طرف جمعیت علما ہند کا وہ گروہ جو پاکستان کی سرزمیں میں آباد تھا، جمعیت علماء اسلام کے نام سے سرگرم ہو گیا۔ یہ لوگ دین کے پرخلوص کارکن تھے اور ان کے بڑے رہنماؤں کا تحریک آزادی میں شاندار رول رہا ہے۔ ان کے علاوہ پاکستان کے حامی علمائے دین بھی تھے جو قائداعظم کے ساتھ تھے لیکن قائداعظم کے جانے کے بعد یہ لوگ آہستہ آہستہ بے اثر ہوتے چلے گئے یا شعوری غیر شعوری طور پر عالمی عرب سلطنت کا خواب پورا کرنے میں جت گئے جسے عالمی غلبہ اسلام کا نام دیا گیا ہے۔ جمعیت علماء اسلام بھی بہت دیر تک اپنے حریت پسند سامراج دشمن کردار کو قائم نہ رکھ سکی یا شائد مختلف فکری الجھنوں کا شکار ہو گئی کیونکہ انگریز کے خلاف عظیم الشان تحریک آزادی میں پروان چڑھنے والی علما کی وہ نسل جو 1947ء میں سرگرم عمل تھی آہستہ آہستہ ختم ہو گئی اور ان کی جگہ اس نسل نے لی جو پاکستان کی تنگ نظر جاگیرداری سیاست اور جماعت اسلامی کے مخصوص عزائم کے ماحول میں جوان ہوئی تھی۔

پاکستان میں جماعت اسلامی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اگرچہ تعداد اور عوامی حمایت کے اعتبار سے اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں تاہم کمیونسٹ پارٹی جیسی تنظیم، زبردست نفسیاتی حربوں اور امریکی عربی تائید کے ذریعے اس جماعت نے اس ملک کی مقبول ترین جماعتوں اور شخصیتوں کو بھی دفاعی پوزیشن میں دبائے رکھا ہے۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ قائد

اعظم کے بعد ایک تو قیادت کرنے والوں کے اپنے مفاد اس میں تھے کہ بیداری کی لہر تیز نہ ہو اور دوسرے ایک ایسی اسٹیبلشمنٹ وجود میں آ چکی تھی جس کی سربراہی جرنیلوں کے ہاتھ میں تھی جو جمہوریت سے متصادم نظریات رکھتے ہیں اور جماعت اسلامی ان کی فطری حلیف ہے۔ چنانچہ جماعت کو ان کی تائید اکثر ادوار میں حاصل رہی ہے، چاہے ایوب خان کے دور کا تھوڑا عرصہ اور جنرل مشرف کے کچھ اہلکاروں کا جماعتِ اسلامی سے اختلاف استثنا ہے۔ تاہم ان ادوار میں بھی جماعت نے 17 ویں آئینی ترمیم کے لیے جنرل مشرف کا ساتھ دیا اور اسٹیبلشمنٹ کے اکثر عناصر جماعت کے حامی رہے۔ سو جماعت نے پاکستان کے قوم پرست اور روشن خیال عناصر کو آسانی سے روکے رکھا ہے اور پاکستان کو کبھی اس رستے پر چلنے نہیں دیا جو قومی آزادی اور عوامی فخر کی طرف جاتا ہے۔

اس سلسلے میں جماعت کا رول قائداعظم کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف خصوصاً قابل ذکر ہے۔ بھٹو نو آبادیاتی اور سامراجی غلبہ کے خلاف مسلم اقوام کا وہ راہنما تھا جس کے پاس ذہانت بھی تھی، علم بھی، تجربہ بھی اور عوام کی وہ بے پناہ تائید بھی جو اس سے پہلے صرف قائداعظم کو حاصل ہوئی تھی۔ وہ عربوں کو اور دوسری مسلم اقوام کو ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ اپنی زبردست قوت فیصلہ اور مسلسل سرگرمی سے اس قائد نے تھوڑے سے عرصہ میں شاندار قومی اور مسلم نواز منصوبوں کی بنیاد رکھی۔ لیکن اسلام کے نام پر مسلمانوں سے دشمنی کرنے والے عناصر نے ان دیکھی قوتوں کی تائید سے اور معاشرہ کے محدود مفادات کی نمائندگی کرنے والے عناصر کی مدد سے بھٹو کے خلاف سخت ترین مزاحمت کا عمل جاری رکھا۔ حتیٰ کہ 1977ء میں اِن اَن دیکھی قوتوں نے پی این اے کی ایجی ٹیشن اور جنرل ضیاء کی سازش کے ذریعے بھٹو کی حکومت گرا دی اور عوام کے اس نہائت موثر راہنما کو ایک عدالتی ڈرامہ کے ذریعہ قتل کر دیا گیا۔

مدرسوں اور آئمہ مساجد کا وہ بڑھتا ہوا جارحانہ انداز جو مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی

بار دیکھنے میں آ رہا ہے، یا مرون با لمعروف و ینھون عن المنکر کی عملی شکل نہیں۔ کیونکہ اس آیت کا مقصد ایک منظم مسلم معاشرے میں ایک جائز حکومت کے ماتحت ایک زندہ مسلم معاشرے کی نشوونما کا تحفظ ہے۔ جب تک کسی حکومت کو جائز حکومت تصور نہیں کیا جاتا ایسی کسی جماعت یا گروہ کی تقرری ناممکن ہے۔ لیکن ایسی حکومت کی عدم موجودگی میں یا ایسے تقرر کے بغیر کسی عالم دین یا اس کے گروہ کا یہ دعوی شرعی اور عقلی بنیاد پر مہمل ہے کہ وہ مسلمانوں کے نمائندہ ہیں یا اللہ کی طرف سے مقرر کردہ۔ نہ ہی کسی شخص یا ادارے کو پاکستان کے شہریوں کے عقائد کی جبری اصلاح یا نگرانی کا حق ہے۔ نہ ہی دینی عقائد یا کسی بھی قسم کے عقائد پر کوئی تعزیر نافذ کرنے کا حق ہے۔ موجودہ حالات میں مذہبی جذبات کا استعمال کر کے اپنے مخالفین کو مدافعانہ پوزیشن میں دھکیل دینا ایک ایسا ہی عمل ہے جیسے سڑک پر چلتے ہوئے کسی شخص کے خلاف بلند آواز سے یہ الزام عائد کر دینا کہ اس نے فلاں مقدس ہستی کو گالی دی ہے، اور اس الزام کی طاقت سے مشتعل ہجوم کو کسی بے گناہ کے قتل پر اکسانا۔

ہر دستور کی طرح اسلام بھی فرد کے اس بنیادی حق کا محافظ ہے کہ اکثریت اپنی اجتماعی طاقت سے فرد پر ظلم نہ کر سکے (جس نے ایک فرد کو بغیر حق قتل کیا اس نے گویا پوری انسانیت کو قتل کیا) یعنی فرد کے خلاف کسی تادیبی عمل کا حق صرف قانون کو حاصل ہے۔ ہمارے ہاں دین کے نام پر انفرادی یا گروہی قانون شکنی جاری ہے جس کے خلاف ہمارے مذہبی عناصر نے کبھی کوئی تبلیغ نہیں کی، کیونکہ یہ ان کے دبدبہ کو قائم رکھنے میں مدد دیتی ہے۔

اسلامی ریاست کے قیام کے لئے ایک راستہ وہ تھا جو جامعہ حفصہ کے المیہ میں جان دینے والوں نے اختیار کیا یعنی مسلح بغاوت کے ذریعے حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کا رستہ، جس میں غالباً انہیں توقع تھی کہ مسلم عوام اور مسلح افواج ان کی دعوت پر اٹھ کھڑے ہوں گے، جو نہ ہو سکا یعنی جیسے مدینہ میں رسول اللہ کے وصال کے بعد مرکزی شہر کے مسلمان حضرت ابوبکرؓ کی قیادت پر متفق ہو گئے۔ اس انداز سے اسلام آباد میں نہیں ہوا۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہمارے بعض مذہبی سکالر اور مولوی حضرات اسلامی روایت کا مطالعہ کرتے کرتے کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی اپنے آپ کو اسلام کے عظیم ترین اکابر کے ہم پلہ سمجھنے لگ جاتے ہیں گرچہ کہتے نہیں۔ اور دوسری اُلجھن یہ ہے کہ ان حضرات کے ہاں وقت اور تاریخ کے بارے میں یہ تصور رائج ہے کہ ہر چیز ویسی ہی ہے جیسی تھی اور تبدیلی کوئی حقیقت نہیں رکھتی یعنی تاریخ جامد و ساکت کھڑی ہے۔

اسلامی ریاست کے قیام کا دوسرا راستہ عام انتخابات کے ذریعے ملک کی حکومت حاصل کرنے کا ہے جو کہ ابھی تک اس لئے کامیاب نہیں ہو رہا کہ عوام ہماری دینی جماعتوں کو ووٹ نہیں دیتے۔

اب اگر تیسرا کوئی راستہ موجود ہے تو ہمارے علم میں نہیں۔ کیونکہ کسی جرنیل کا فوجی وردی پہن کر امیر المومنین بن جانا تو پہلے اس ملک میں آزمایا جا چکا ہے۔ ایسے جرنیل کی فطری یا غیر فطری موت کے بعد صرف دوسرا کمانڈر انچیف ہی امیر المومنین بن سکتا ہے جس کی دینی راہنمائی کوئی مولانا محترم کر رہے ہوں لیکن یہ ہندوؤں کے کھشتری اور پنڈت کا نظام ہوگا اور اگر اسے اسلامی کہیں تو غالباً عجیب سا اسلامی نظام ہوگا جس کی اسلامی فقہ میں کوئی جگہ ہمارے علما بنا سکتے ہیں یا نہیں اس کا جواب وہ خود ہی دے سکتے ہیں۔

Jurat-e-Tehqiq

قیام خلافت کا مغالطہ

بیسویں صدی میں سید قطب اور سید مودودی کی اسلامی تحریکوں کا دعویٰ یہ تھا کہ مسلم امت کی ایک مرکزی اسلامی ریاست قائم کی جاسکتی ہے جو خلافت راشدہ کے نمونے پر ہوگی۔ گرچہ حسن البنا کی اخوان المسلمون سید قطب سے پہلے ایک سرگرم تحریک تھی اور اس کی پہلی شکل اخوان کے بانی شیخ عبدالوہاب تھے لیکن سید قطب جدید زمانے میں اس تحریک کے سب سے موثر نظریہ ساز تھے۔ تاہم 1960ء کے عشرہ میں سید قطب پر جمال عبدالناصر کی حکومت نے مقدمہ چلا کر 1966 میں انہیں سزائے موت دے دی تو ان کی تحریک زیادہ موثر نہ رہی یا یوں کہیں کہ زیر زمین چلی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت ایمن الظواہری اور اسامہ بن لادن کی سرگرمیوں کے پیچھے سید قطب کے نظریات ہیں۔ سید قطب جو مولانا مودودی سے متاثر تھے، خود مولانا محترم سے بھی زیادہ خالص اسلامی نظام کے علم بردار تھے، کیونکہ عرب بھی تھے اور وہابی بھی۔ اگرچہ وہ ظاہر کے اعتبار سے جدید دور کے انسان دکھائی دیتے تھے اور انہیں مولانا مودودی کے برعکس جوانی میں امریکہ رہنے اور امریکی دوشیزاؤں کے شیطانی حربوں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا جس پر انھوں نے امریکہ کے جاہلیتی نظام کے ضمن میں لکھتے ہوئے اپنی کتاب ''معالم فی الطریق'' (راستے کے نشان) میں خوب روشنی ڈالی ہے۔ مولانا مودودی مرحوم کو امریکہ جانے کا موقع زندگی کے آخری دنوں میں ملا جب وہ اپنے گردوں کے علاج کے لیے وہاں تشریف لے گئے کیونکہ درست علاج کی سہولت سعودی عرب یا کسی دوسرے

اسلامی ملک میں نہ تھی۔ تاہم دونوں عظیم اسلامی مفکروں کے سامنے یہ واضح نصب العین تھا کہ ایک ایسی صالح جماعت تیار کی جائے جو آج کی مغرب زدہ سوچ سے بالکل آزاد ہو کر اسلامی ریاست کی دوبارہ بنیاد رکھے۔ سید قطب نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں مسلمانوں کی ایک ایسی نسل تیار کرنے کا نقشہ پیش کیا جو بقول ان کے مسلمانوں کی پہلی نسل کی طرح قرآن کے علاوہ ہر علم کو اپنے لئے ممنوع قرار دے دے۔ جدید دنیا سے کچھ نہ سیکھے صرف ان کی ٹیکنالوجی کے ثمرات لے لے، یعنی آلات نقل و حمل اور آلاتِ جنگ۔ یہ نئی نسل ایک اسلامی ریاست قائم کر کے مغرب کے نظام جاہلیت کے بنائے ہوئے آلات و وسائل جنگ کی مدد سے دنیا کے خلاف جہاد کرے، اس وقت تک کہ جب سارا عالم (جسے وہ عالم جاہلیت کہتے ہیں) اسلام کی قوت کے ہاتھوں شکست کھا کر "ذلت کے ساتھ خود اپنے ہاتھوں سے جزیہ دے"۔

یہ انداز مولانا مودودی کے انداز سے بھی زیادہ جارحانہ تھا۔ یہ غالباً جغرافیائی کلچر کے اثرات تھے کہ مولانا محترم شدید ترین فاتحانہ امنگوں کے باوجود اُتر پردیش کے مسلمانوں کی مہذب روایتِ سخن سے پوری طرح الگ نہ ہو سکے۔ مولانا مودودی محترم کے مقابلے میں سید قطب کا انداز سیدھا سادہ فاتحانہ تھا۔ انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے ارادے بیان کر دیئے اور ساری دنیا کو کھلے لفظوں میں جاہلیت کی دنیا قرار دیا جو کہ تباہ ہونے اور تسخیر ہونے کی مستحق ہے۔ ان کی نظر میں جو مسلمان مفکر تبلیغ و دعوت اور فکری جہاد اور جہاد برائے مدافعت کی بات کرتے ہیں دراصل خون کی کمی اور ایمان کی کمزوری کا شکار ہیں۔ ان کے خیال میں اسلام میں جہاد کا مفہوم فتح و تسخیر کے لئے مسلسل حملہ کرنا اور دنیا پر اسلام کی حکومت قائم کرنا ہے۔ اسلام کے علاوہ ہر نظام چونکہ باطل ہے اور ظالمانہ ہے اور چونکہ اسلام اللہ کا واحد دین ہے لہٰذا ہر دین اور ہر نظام جو اسلام کے علاوہ ہے، تباہ و برباد کئے جانے کا مستحق ہے۔ یہی اللہ کا منشا اور حکم ہے۔ یہی مسلمان کی زندگی کا اولین مقصد ہے اور یہی دنیا کا مستقبل ہے۔ انھوں نے لکھا کہ لا اکراہ فی الدین یعنی دین میں کوئی جبر نہیں، کا اطلاق صرف اس وقت شروع ہو گا

جب ساری دنیا کے انسان فتح کئے جانے کے بعد اسلامی ریاست کے ماتحت آ جائیں گے۔ تب ہر شخص کو آزادی ہوگی کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق عمل کرے۔۔ تب غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا بلکہ انہیں صرف ذمی کی حیثیت سے جزیہ دینا ہوگا اور تذلیل قبول کرنی ہوگی جو ان کے غیر مسلم رہنے کی سزا ہے۔ کیونکہ قرآن کی آیت 9:29 کا یہی حکم ہے۔ موجودہ پاکستان میں کالعدم شدت پسند تنظیموں کے علاوہ طالبان اور ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی تنظیم اسلامی کا یہی موقف ہے چنانچہ ان کو سید قطب کا جانشین سمجھا جا سکتا ہے۔

مولانا مودودی مرحوم نے اپنے عزائم غالباً اتنے واضح لفظوں میں بیان نہیں فرمائے۔ تاہم ان کی کسی تحریر میں دنیا کے دیگر مذاہب اور معاشروں کو یہ تسلی نہیں دی گئی کہ انہیں آزاد رہنے دیا جائے گا۔ ایک جہاندیدہ اور معاملہ فہم سیاست دان کی حیثیت سے انھوں نے غالباً ایسے بلند آواز اعلان جنگ کو قبل از وقت سمجھا ہوگا۔ تاہم اس امر میں کوئی لگی لپٹی نہیں کہ دنیا کو ایک مرکزی اسلامی نظام خلافت کی ضرورت ہے جو ان کے خیال میں نہ صرف ممکن ہے بلکہ دراصل اس کا وقت بہت ہی قریب ہے۔

کہتے ہیں ایک نوجوان نے 1965ء میں مولانا محترم کی خدمت میں حاضر ہو کر چند سوالات پیش کئے تھے جو یہاں دوہرانا بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ مولانا محترم نے یا کسی دوسرے اسلامی عالم نے ان سوالوں کا جواب اپنی کسی تحریر میں نہیں دیا یا کم سے کم ہمارے علم میں ایسا کوئی جواب موجود نہیں۔ اور یہ سوال آج بھی قائم ہیں جبکہ دنیا پر اسلام کا غلبہ قائم کرنے کے دعووں پر ایک تحریک چل رہی ہے، جس میں ہزاروں باصلاحیت مسلمان اپنی صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں، بلکہ جان تک کے نذرانے دے رہے ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ تحریک کے رہنما ان سوالوں کے جواب فراہم کریں تاکہ مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلیں اپنی قربانیوں کا درست مصرف دیکھ سکیں۔ اب یہ سوال کسی بھی ایسے عالم کی خدمت میں پیش کئے جا سکتے ہیں جو اسلامی مملکت کے لئے جہاد کے قائل ہیں۔

1۔ رسول اللہ ﷺ کی حاکمیت کی بنیاد وحی پر تھی۔ یعنی انہیں اللہ نے لوگوں کا حکمران بننے کے لئے منتخب کیا تھا۔ آپ کے وصال کے بعد چاروں خلفا راشدین الگ الگ طریقے سے سربراہ بنے۔ پہلے خلیفہ کا انتخاب چند لوگوں کے اجلاس میں بحث و تمحیص کے بعد ہوا۔ دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمرؓ کو پہلے خلیفہ رسول نے نامزد کیا جس میں کسی بحث کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ تیسرے خلیفہ کا تقرر چھ صحابہ کے آپس کے تبادلہ خیال کے ذریعے ہوا جنھیں دوسرے خلیفہ نے نامزد کیا تھا۔ جبکہ چوتھے خلیفہ کا تقرر الجھنوں اور بالآخر مسلمانوں کی جزوی تائید سے ہوا جسے حضرت امیر معاویہؓ نے تسلیم نہیں کیا لہذا دو مرکز قائم رہے۔ تقرر کے ان مختلف طریقوں کا بیان قرآن حدیث یا خود خلفا راشدین کے کسی فیصلے میں نہیں، نہ ہی قرآن اور حدیث میں سربراہ کے انتخاب کا کوئی طریقہ موجود تھا اور یہی وجہ تھی کہ خلفا راشدین کے تقرر کے لئے یہ مختلف طریقے استعمال ہوئے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آپ یا کوئی شخص جو اب خلیفہ رسول یا امیر المومنین یا سربراہ امت بنے گا اس کے تقرر کا کیا طریقہ ہوگا۔۔۔ یعنی خلفا راشدین میں سے کس خلیفہ کا اصول۔

2۔ اگر مان لیا جائے کہ آپ کو اجتہاد کا حق مل گیا ہے، حالانکہ اجتہاد کے لئے شرط ہے کہ آپ مسلم امہ کے ایسے معتبر عالم تسلیم کر لئے گئے ہوں جس پر کسی کو اختلاف نہ ہو۔ جبکہ آپ یا کوئی عالم دین یہ شرط پوری نہیں کرتا، اور موجودہ صورتحال یہ ہے کہ برصغیر اور دنیا بھر کے مسلم عوام کی اکثریت اور شیعہ مسلمان، جو ایران اور عرب کے کئی ممالک میں بڑی تعداد میں موجود ہیں، آپ کے نظریات کو شیخ وہاب کے نظریات سمجھتے ہوئے آپ سے شدید اختلاف کرتے ہیں۔ تو کیا آپ ان کروڑوں مسلم عوام کو مرتد اور واجب القتل قرار دیں گے؟ کیا انہیں بھی غیر مسلم آبادیوں کی طرح فتح کیا جائے گا؟ کیا برصغیر اور دنیائے عرب کے تمام مزار تباہ کئے جائیں گے؟ اس طرح کے خدشات کی بنیاد موجود ہے، کیونکہ حضرت محمد بن عبدالوہاب کے پیروکار الاخوان نے 1801ء میں کربلا میں حضرت امام حسینؓ کا مزار تباہ کیا تھا۔ (مولانا

صوفی محمد کی قیادت میں طالبان نے حال ہی میں پاکستان کے تقریباً تمام مسلمانوں کو خارج از اسلام قرار دیا ہے اور طالبان نے ہی پشاور میں رحمٰن بابا کا مزار تباہ کیا ہے)۔

اگر مان لیا جائے کہ آپ اجتہاد کے ذریعے الیکشن کا مغربی جمہوری نظام استعمال کر سکتے ہیں تو کیا آپ منتخب ہونے کے بعد یا کسی بھی طریقے سے سربراہ بننے کے بعد پاکستان کے امیر المومنین ہوں گے یا امت اسلمہ کے؟ اور آپ ملک کی مسلح افواج کو اور دوسرے اداروں کو موجودہ انتظام کے تحت رکھیں گے یا انہیں منتشر کر کے نئی افواج کا حکم جاری کریں گے؟ کیا مسلح افواج سے آپ کو امید ہے کہ وہ تابعدار رہیں گی؟ اور اگر وہ بغاوت کریں تو کیا آپ کے پاس ایسا کوئی طریقہ ہے کہ آپ اس بغاوت کو فرو کر دیں۔

اگر مولانا زندہ ہوتے تو آج کا نیا سوال یہ ہوتا: کچھ عرصہ سے القاعدہ اور طالبان مسلح جنگ کے راستہ سے اسلام نافذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، جبکہ آپ ووٹ کا راستہ صحیح مانتے ہیں۔ کیا آپ ایک دوسرے کی اطاعت کریں گے؟

3۔ اگر آپ صرف پاکستان کے اسلامی سربراہ ہوں گے تو باقی اسلامی آبادیوں اور قوموں کا نصیب کیا ہوگا؟ اور کیا آپ دنیائے کفر کے خلاف جہاد کے لئے باقی مسلم امت کے بغیر صرف پاکستانی افواج کو استعمال کریں گے؟ یعنی برصغیر ہند، روس اور چین کو فتح کرنے کے لئے کیا اپنی فوج کافی ہوگی؟ یا ان غیر مسلم اقوام کو اسی حالت میں رہنے دیں گے؟

4۔ اگر ایسا نہیں اور آپ کو پوری امت مسلمہ کو متحد کرنا ضروری نظر آتا ہے جس عزم کا آپ بار بار اظہار کر چکے ہیں تو کیا آپ تمام مسلم ممالک کو اپنی مملکت اسلامیہ تصور کریں گے؟ تو کیا وہ اپنی اپنی قومی حکومتیں ختم کر کے آپ کے ماتحت آ جائیں گے یعنی افغانستان، ایران، جزیرہ عرب کے ممالک، مصر، انڈونیشیا اور ملائشیا وغیرہ؟ اور اگر انہوں نے آپ کو تسلیم نہ کیا جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر ہوا تھا تو کیا آپ ان ممالک پر فوج کشی کریں گے اور ان کی حیثیت مرتد کے طور پر مقرر کر کے ان کی مکمل شکست تک جنگ کریں گے؟

خلافت راشدہ کے بعد صدیوں تک مسلم سلطنت قائم رہی۔ وہ دنیا کی سب سے طاقتور سلطنت تھی، پھر بھی مسلم حکمرانوں نے ساری دنیا پر اسلام کا پرچم لہرانے کی کوشش نہیں کی۔ روس، چین، مشرق بعید اور یورپ کے وسیع علاقے اور انسان اسلامی یلغار سے محفوظ رہے۔ کیا صدیوں تک مسلم امہ کی نسلیں اپنے دینی فریضہ سے غافل رہیں؟ یا آج کی طاقتور اقوام کو فتح کرنا زیادہ آسان ہوگیا ہے؟

5۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ ان تمام مرحلوں کے بغیر مشیت ایزدی سے ایک ایسا معجزہ ہو جائے کہ ساری امت مسلمہ آپ کو امیر مان کر آپ کے تابع فرمان ہو جائے تو آپ بھارت، چین، روس، یورپ اور امریکہ کو فتح کرنے کے لئے کیا حکمت عملی اختیار کریں گے؟ اور اگر یہ اس وقت تیار ہوگی تو کیا اصولاً آپ اس تسخیر کے عمل کو تسلیم کرتے ہیں؟ دنیا کی موجودہ غیر مسلم اقوام بظاہر اسلام کی مخالفت نہیں کرتیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ چین کے علاوہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جو مسلم مبلغین کو اسلام کی تبلیغ سے روکتا ہو۔ غلبۂ اسلام کے تقریباً تمام سرکردہ مفکر اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کوئی نظام حکومت اپنے عوام کو اسلام کا پیغام سننے اور قبول کرنے سے روکتا ہو تو اس نظام حکومت کے خلاف اسلحہ سے جہاد کرنا مسلم حکمرانوں کا پہلا فرض ہے اور یہ جہاد تب تک جاری رہے گا جب تک اس جاہلیتی نظام کے لوگ شکست کھا کر بکی کے ساتھ جزیہ دینے پر تیار نہ ہو جائیں، حتیٰ کہ وہاں کے عوام اسلامی حکومت کے ماتحت آکر اپنے مذہب کے خلاف ہمارے علمائے کرام کی تقاریر آزادی سے سن سکیں اور جزیہ ادا کر کے زندہ رہنے یا اسلام قبول کرنے کے لئے آزاد ہوں تو کیا چین اس اعتبار سے پہلا ملک ہوگا جس پر فوج کشی اور جہاد فی سبیل اللہ ہماری اسلامی ریاست کے لئے سر بسر لازم ہوگا؟

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت محمد بن عبدالوہاب کا موقف رہا ہے کہ ایسے تمام نظام جاہلیتی ہیں جو اسلامی حکومت کے ماتحت آنے سے انکار کریں۔ آپ نے بھی اپنے رسالہ "ارتداد کی سزا" مطبوعہ 1940ء کے آخری صفحات پر اسی موقف کا اعلان فرمایا تھا، سید قطب

نے معالم فی الطریق کے باب جہاد فی سبیل اللہ میں وضاحت کے ساتھ لکھا کہ آج کے تمام معاشرے جہاد کے ذریعے فتح کیے جائیں گے اور وہاں اسلامی شریعت تلوار کے زور پر نافذ کی جائے گی۔

(اس وقت القاعدہ کی سربراہی میں طالبان کی جہادی سرگرمیاں اسی عزم کے ساتھ جاری ہیں کہ اسلام صرف مسلم سرزمینوں کی مدافعت کا حکم نہیں دیتا بلکہ تمام ممالک کو فتح کر کے اسلامی قانون نافذ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ غلبۂ اسلام کی موجودہ تحریک کا موقف ہے کہ اگر کوئی معاشرہ یہ کہے کہ ہم اپنے نظام سے خوش ہیں یا یہ کہے کہ ہم نہ خود کو مریض سمجھتے ہیں نہ آپ کو حکیم، تو ہم ایسے معاشرہ کو صرف ان کے کہنے پر ان کے حال پر نہیں چھوڑ سکتے۔ بلکہ ہم ان کا جبراً علاج کریں گے یعنی انہیں فتح کر کے اسلام کی برکات سے فیض یاب کریں گے، کیونکہ دنیا بھر کے جدید معاشرے دراصل بھٹکے ہوئے دائمی مریض ہیں جنھیں اپنے امراض کی عادت پڑ چکی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ انہیں ہماری حکمت کی کتنی ضرورت ہے۔ ہم دنیا کے حکیم ہیں، یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے کہ دنیا بھر کی مریض اقوام کو کیا چاہیے)

اب عملی صورتحال یہ ہے کہ چین، روس، یورپ اور امریکہ مہلک ترین ہتھیاروں سے لیس ہیں اور ان ممالک کے لوگ اپنے اپنے ملکی نظام سے اتنے خوش ہیں کہ اس کے تحفظ کے لئے شدید جنگ کرنے پر تیار نظر آتے ہیں۔ احتمال ہے کہ ان ممالک کی فوجی کارروائیوں میں مسلم افواج لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں کام آئیں گی۔ کیا آپ کی دانست میں یہ کروڑوں شہادتیں ضروری ہیں؟ اور کیا ان کروڑوں شہادتوں کے بعد آپ اپنی عالمی مملکت قائم کرنے اور قائم رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟

6۔ جیسا کہ آپ نے خلافت و ملوکیت میں تسلیم کیا ہے، رسول اللہ ﷺ کی ذاتی تربیت پانے والے وہ مسلمان جن کی عظمت ایمانی اور صداقت اور علم (خود آپ کے خیال کے مطابق) قیامت تک انسانیت کے لئے مثال ہے، وہ خلافت راشدہ کو تین عشروں تک بھی قائم

نہ رکھ سکے اور ملوکیت نے خلافت کی جگہ لے کر حقیقی اسلامی ریاست کو ختم کر دیا۔ تو آپ کو کیسے یہ یقین ہے کہ خلافت کا جو صالح نظام آپ رائج کرنے والے ہیں وہ زیادہ دیر قائم رہ سکے گا؟ کیا آپ میں سے کوئی (یا اسامہ بن لادن) معاذ اللہ معاذ اللہ خود کو رسول اللہ ﷺ سے بہتر معلم اور تنظیم کار سمجھتا ہے اور اپنی جماعت کو صحابہ کی جماعت سے زیادہ مستحکم، زیادہ منظم اور زیادہ با کردار؟

7۔ اور اگر آپ جانتے ہیں کہ یہ سب ناممکن ہے تو آپ کے پیش نظر اصل مقصد کیا ہے جس کے لئے آپ نوجوانوں کو نسل در نسل قربان کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک کبھی نہ مکمل ہونے والے مشن کے لئے اپنی صلاحیتیں حتیٰ کہ اپنی زندگیاں صرف کرتے رہیں؟

1740ء کے لگ بھگ شیخ عبدالوہاب نے جس نئی تحریک خلافت کی بنیاد رکھی تھی جس کے لئے لاکھوں مسلم نوجوانوں نے اپنی صلاحیتوں کی قربانی دی ہے اور جدید علوم سے منہ موڑ کر اپنی قوموں کی تعمیرِ نو کو یہ کہہ کر حرام قرار دیا ہے کہ اسلام قوموں کو نہیں امت کو مانتا ہے، وہ تحریک سید قطب اور سید مودودی سے ہوتی ہوئی ان گنت تصادمی تنظیموں کی شکل میں پرخلوص اور سادہ دل مسلمانوں کے خون میں نہاتی ہوئی بالآخر امریکہ کو دنیا کی واحد سپر پاور بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ اور ایسے لگا جیسے خلافت اسلامیہ کے معنی دنیا بھر میں کارپوریٹ امریکہ کی سلطنت قاہرہ کا قیام تھا۔ اور آج اسی سلطنت قاہرہ کے اگلے منصوبے کی تکمیل کے لئے انتشار، قتل و غارت گری اور طوائف الملوکی کا عمل جاری ہے۔ جس نے امتِ مسلمہ کو اپنے انسانی وسائل کی تربیت و تنظیم سے متنفر کر دیا ہے اور اس بات کو یقینی بنا دیا ہے کہ توانائی کے خزانوں سے مالا مال یہ قومیں کبھی علم کی اس شکل کو حاصل نہ کر سکیں گی جس سے اُن وسائل کا استعمال ان کے اپنے عوام کے فائدے کے لئے ہو سکے۔

آج کی دنیا علم و ہنر تک عام رسائی کی دنیا ہے۔ علم کی فطرت ہے ظاہر ہونا اور پھیلنا۔ انسان کی فطرت ہے کہ سیکھنے نکلے تو موجود اور معلوم کو پا لیتا ہے۔ نامعلوم کو معلوم بنانے

اور غیر موجود کو عالم وجود میں لانے کا نصب العین آدم کو پہلے دن ودیعت ہو گیا تھا، اور اس نصب العین تک پہنچنے سے آدمی کو صرف اس کے اپنے ارادوں کا فتور ہی روکتا ہے ورنہ اور کچھ بھی روک نہیں سکتا۔ یہ بات وہ قوتیں اچھی طرح جانتی ہیں جنھیں علم کی فضیلت حاصل ہے، یہ دور علم کی معیشت کا دور ہے اور یہ قوتیں جانتی ہیں کہ انسانوں کو ذہنی نشوونما سے روکنے کے لئے جبر کے ہتھیار مہمل ہیں اور دیواریں کھڑی کرنا بے کار ہے۔ جبکہ علم کی معیشت میں کسی قوم کی سربراہی یا پسماندگی کا انحصار علم کے حاصل کرنے اور علم کو چھوڑنے پر ہے۔ لہٰذا کسی قوم کو علم کی مملکت سے محروم رکھنے کا صرف ایک ہی حربہ ہے اور وہ یہ کہ لوگ رضا کارانہ طور پر علم کے راستے سے ہٹ جائیں۔ یعنی وہ حربہ جو ''معالم فی الطریق'' میں سید قطب نے تجویز کیا۔ انہوں نے کہا ''ہم نے مسلمانوں کی ایک ایسی نسل تیار کرنی ہے جو اپنے اوپر قرآن کے علاوہ علم کے تمام دروازے بند کر لے'' اور اس عمل کو قرآن سے عقیدت کے نام پر کیا جائے۔ پھر جب وہ دروازے جن سے علم کی روشنی اندر آ سکتی تھی، خود پر بند کر کے یہ نسل ایک دوسرے کے خلاف چھریاں پکڑ لے تو دروازوں پر علمائے دین پہرہ دینے کے لئے کھڑے ہو جائیں کہ کہیں کوئی یہ دروازے کھولنے کی کوشش نہ کرے۔ چنانچہ آج اس کی عملی شکل یہ ہے کہ مسلم ممالک میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً علمی اختلاف اور مباحث کو ایسے بند کیا گیا ہے کہ نئی نسل کا مطالبہ ہی نہیں کہ اختلاف اور اظہار رائے کی اجازت دو۔ یہی صورتحال ضمانت ہے مسلمانوں کو جہالت کے صحراؤں میں بھٹکتا رکھنے کی اور مسلمانوں کے ذریعے مسلمانوں کو برباد کرنے کی۔

جرات تحقیق www.RealisticApproach.org جرات تحقیق

اسلام دشمنی کا مبالغہ

ہمارے ہاں بہت سے اضطراب اس غلط فہمی یا مبالغہ پر مبنی ہیں کہ دنیا کی اکثر اقوام اسلام کی دشمن ہیں۔ معاشرت کے اصولوں میں ایک عام اصول ہے کہ اگر ایک شخص یہ گلہ کرے کہ محلے کے لوگ اس کے دشمن بن گئے ہیں تو سننے والے کے ذہن میں دو سوال ابھرتے ہیں۔ اول یہ کہ اتنے لوگ کیوں اس کے دشمن ہوئے ہیں؟ دوسرے یہ کہ اگر اتنے لوگ اس کے دشمن ہوئے ہیں تو کہیں اس شخص میں کوئی خرابی تو نہیں؟

ہمارے دینی طبقے نے عام مسلمانوں کے دل میں یہ بات تو ڈال دی ہے کہ دنیا ہماری دشمن ہے لیکن یہ دونوں سوال اٹھانے اور ان کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

وہ کیا وجوہات ہیں کہ ہمیں اقوام عالم کی مخالفت کا سامنا ہے۔ امریکہ تو شائد عربوں کے تیل پر قبضہ کرنے کے لئے کوشاں ہے (حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ امریکی حکمرانوں اور عربوں کے درمیان یا وسط ایشیا کے حکمرانوں کے درمیان تیل کے مسئلے پر اگر کوئی چپقلش موجود بھی ہے تو ان مسائل میں عوام کو تو کبھی پوچھا ہی نہیں گیا، نہ ہی یہ عوام کی لڑائی ہے)۔ لیکن باقی دنیا کو ہم سے نفرت کیوں ہے؟

پھر پاکستانی سبز پاسپورٹ سے دنیا بھر کی اقوام کی وحشت کس تیل کی وجہ سے ہے؟ افغانستان میں کون سے سونے کے پہاڑ ہیں؟ اور طالبان کا نام سن کر دنیا بھر کے لوگ چوکس کیوں ہو جاتے ہیں؟ کہیں اس کی وجہ ہمارے کردار کی زبوں حالی، قانون سے نفرت،

اپنے علاوہ سبھی کو گمراہ اور جہنمی اور گندے اور ناپاک سمجھنے کی خود اعتمادی، سارے عالم کو فتح کرنے کے نعرے، دنیا بھر کے ممالک میں اپنے پیچھے اپنی ہوشیاری اور فنکاری کی کہانیاں چھوڑنا، پھر اگر وہاں کے قوانین روکیں تو سر پر ہاتھ رکھ کر واویلا کرنا کہ یہ قومیں بہت متعصب ہیں، کیا یہ سب وجوہات تو نہیں؟

عربوں کی شہرت دنیا میں ہم سے زیادہ مختلف نہیں۔ کاروبار سے لے کر جنسی مسائل تک مسلمانوں کے معاملات قابلِ فخر نہیں۔ کیا لوگوں کا ان غیر معیاری رویوں پر احتجاج کرنا اسلام دشمنی ہے؟ یعنی اس میں اسلام کی بحث کہاں سے آئی؟ پھر چین سے اچانک کیا غلطی سرزد ہوئی ہے کہ اس کے شہریوں اور کارندوں کو پاکستان میں قتل کرنا اور صوبہ سنکیانگ میں اسلام کے نام پر غدر مچانا ضروری ہو گیا ہے؟ پھر یورپ کے کسی ایک ملک کے ایک اخبار کی ایک گستاخی کیا اس امر کا اٹل ثبوت ہے کہ سارے اہل مغرب اسلام کے دشمن ہیں اور وقت آ گیا ہے کہ آگے بڑھ کر ان کافر قوموں کو سبق سکھایا جائے یا کم از کم ان ممالک سے سفارتی تعلقات ہی توڑ لئے جائیں؟ ہمارے علمائے کرام اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان معاشروں کی یہ مجبوری ہے کہ وہاں شخصی آزادی اور جمہوریت کے قوانین کی وجہ سے حکومت کسی فرد کو اپنے نظریات کے اظہار سے روکنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ چنانچہ برطانیہ یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کو آزادی ہے کہ وہاں کی تہذیب و ثقافت کو جاہلیت اور گمراہی کہیں، وہاں اسلامی نظام و قانون نافذ کرنے کی بات کریں، جبکہ ہم اپنے ملکوں میں اقلیتوں کو ایسا کہنے کرنے پر جان سے مارنے پر تیار رہتے ہیں۔ آزادیوں اور برداشت کا یہ فرق قانون اور کلچر کے فرق سے ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی ہمارے مذہبی رہنما جو ان ممالک کے بیسیوں دورے کر چکے ہیں، ہمارے عوام کو یہ کہہ کر مشتعل کرتے ہیں کہ اگر ان ممالک کی حکومتیں ہمارا حکم نہیں مانتیں یعنی اپنے ان بیہودہ اور غیر ذمہ دار افراد کو پھانسی پر نہیں لٹکاتیں جنھوں نے شان رسالت میں گستاخی کی ہے تو طے ہوا کہ یہ حکومتیں اور یہ معاشرے اسلام کے دشمن ہیں!

جہاں تک وسائل پر قبضہ کا تعلق ہے یہ معاشی مفاد کی جنگ ہے جس کا تعلق مذہب سے نہیں۔ معاشی مفادات کے لئے یورپی اقوام نے آپس میں جنگیں لڑیں جب کہ وہ سب عیسائی تھے۔ مسلمانوں نے مسلمانوں سے جنگیں لڑیں، نام جو بھی رکھیں لیکن یہ جنگیں اقتدار اور معاشی مفاد کی ہی تھیں۔ امریکہ نے بدترین مظالم ویت نامیوں پر کئے، ویت نامی مسلمان تو نہ تھے۔ جب کہ مسلمانوں سے تو امریکہ نے مدتوں محبت نبھائی۔ ایک عرصہ تک یورپ اور امریکہ کے سب سے بڑے دشمن روس اور چین تھے اور سب سے بڑے دوست مسلمان۔ حتیٰ کہ دنیا بھر کے مسلمانوں نے امریکہ کے لئے روس سے جنگ لڑی۔ پاکستان کی حکومتیں اور دینی جماعتیں اس وقت امریکہ کی محبت اور دوستی میں غزلیں گاتی رہیں جب امریکہ کی مخالفت کرنے والوں کو دہریے اور روسی ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ ہماری دینی جماعتیں ان اہل کتاب کی فتح کے لئے نہ صرف وظیفے کرتی رہی ہیں بلکہ امریکہ کے لئے افغان جہاد میں مسلم بچوں کے جوان خون کا نذرانہ پیش کیا گیا۔ اب اچانک ''مغربی تہذیب'' کا اسلام کی دشمن نمبر ایک بن جانا کون سی بدلی ہوئی ایسی صورتحال کا نتیجہ ہے جو دکھائی نہیں دیتی ؟ کیا عربوں کے وسائل تک اہل مغرب کی رسائی کوئی نئی بات ہے؟ کیا مسلم اقوام یعنی مصر، انڈونیشیا، سعودی عرب اور پاکستان میں امریکی اثر ونفوذ حال ہی میں شروع ہوا ہے؟

کیا افغانستان میں امریکی حملہ وہاں کے طالبان کی کسی غلط حکمتِ عملی کے بغیر ممکن ہوا اور کیا عراق پر امریکی حملہ اسلام کی وجہ سے تھا؟ ہر باشعور آدمی جانتا ہے کہ صدام حسین کی حکومت سیکولر تھی اور عراق میں دینی تقسیم اور نفاق کی جو قوتیں موجود تھیں انہیں امریکہ کے معاشی مفادات کی خاطر صدام حسین کی قید سے آزاد کروایا گیا۔ گویا وہ دینی قوتیں جو صدام کے جبر کی وجہ سے اپنا اپنا حصہ مانگنے سے قاصر تھیں امریکی تسلط کے سائے میں اپنے اپنے حصے لینے کے معاہدے طے کر رہی ہیں۔ تو پھر یہ حملہ اسلام کے خلاف کیسے ہوا؟

دنیا کی سرزمینوں پر فاتح کا قبضہ ایک مدت تک دنیا کا دستور رہا ہے۔ خود ہمارے

مسلم فاتحین نے دنیا کے علاقوں پر تسلط قائم کیا اور صدیوں نہ صرف حکومت کی بلکہ وہاں کی مستقل آبادی بن گئے۔ حتیٰ کہ برصغیر میں مسلمانوں کا اقلیت ہونے کے باوجود یہ دعویٰ ہے کہ ہندوستان پر حکومت کرنا ہمارا حق ہے۔ عالمی تاریخ کے اس معیار کو اگر آج بھی معیار مان لیا جائے تو طاقت ور قوموں کا قبضہ غیر قانونی نہیں رہ جاتا۔ قوموں کی خودمختاری اور اپنے وسائل پر ان کا حق وہ فلسفہء حیات ہے جو مکمل طور پر آج کی نام نہاد مغربی تہذیب نے دیا ہے۔ اور یہ حق دنیا بھر کے انسانوں کا حقیقی حق ہے لیکن یہ حق نہ تو ہمارے مسلمان دینی مفکروں نے دیا ہے نہ ہی وہ دنیا کے انسانوں کا یہ حق مانتے ہیں۔ اس لحاظ سے کسی طاقت ور قوم کا ہماری سرزمین پر مسلط ہونا ہمیں حیرت انگیز نہیں لگنا چاہیے۔ تاہم یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔ سچائی یہ ہے کہ فتح اور تسلط کا فلسفہ رد کرنے کے قابل ہے اور یہ کسی بھی وجہ سے ہو، جائز نہیں۔ تاہم ہمارا یہ شکوہ کہ دنیا کی اقوام یا طاقت ور اقوام صرف مسلمانوں کی دشمن ہیں، دو وجہ سے غلط ہے: اول یہ کہ اس کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ معاشی مفادات سے ہے، دوسرے یہ کہ یہ طاقتور اقوام ہر اس علاقے یا قوم پر حملہ آور ہیں جہاں ان کا مفاد مطالبہ کرتا ہے اور اس میں ان کے پیشِ نظر صرف اپنے مفادات ہوتے ہیں۔ کیا چلی، ویت نام، نکارا گوا، چین، روس سمیت امریکی سی آئی اے کی جنگیں مذہب کی بنیاد پر تھیں یا معاشی مفادات کے لیے؟

یہ حقیقت ہے کہ دنیا بھر کے ممالک میں مسلم آبادکار مقامی قوانین کی سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر غلبہ اسلام کے نعرے لگا رہے ہیں۔ میزبان ملک کے اچھے قوانین سے ہمارا احسان مند ہونا تو چھوڑیں، آج کی دنیا کے اصول شہریت بھی یہ اجازت نہیں دیتے کہ ہم مذہبی منافرت پھیلائیں۔ اس سلسلہ میں صحابہ رسول کی وہ ٹولیاں جو اپنے وقت کے ملکوں میں پناہ کے لئے گئیں تھیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایسا کوئی واقعہ بیان نہیں ہوا کہ جن شہروں میں انہوں نے پناہ لی، وہاں انہوں نے غلبہ اسلام کا نعرہ لگایا ہو۔ جبکہ آج ہم دنیا کے ہر ملک میں یہ نعرہ لگا رہے ہیں۔ برطانیہ میں گلوبل اسلامک موومنٹ برطانیہ کی پارلیمنٹ کے متوازی

مسلم پارلیمان قائم کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ سپین میں مسلمانوں کے غلبہ نو کا نعرہ لگایا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ یہ مسلمانوں کی سرزمیں ہے کیونکہ ہم نے یہاں آٹھ سو سال حکومت کی تھی۔ بھارت میں تحریک خلافت اور غلبہ اسلام کے نعرے سنائی دے رہے ہیں جس سے انتہا پسند ہندوؤں کو مسلمانوں کے قتل عام کا جواز فراہم کیا جاتا ہے۔ آسٹریلیا میں بھی تبلیغی سرگرمیاں تبلیغ سے بڑھ کر حکومتی سطح کے عزائم دکھا رہی ہیں۔ سڈنی کے ایک عربی النسل امام مسجد نے، جو سالہا سال سے سرکاری وظیفے پر یعنی بے روزگاری الاؤنس پر تھا، وزیراعظم جان ہاورڈ کو ہدایت کی تھی کہ وہ اور آسٹریلیا کی سفید فام آبادی اپنے کردار کی اصلاح کے لئے ہم سے سیکھیں۔ یہ خود اعتمادی اور فخر ہمارا شناختی نشان بن گیا ہے جس سے ترقی یافتہ قوموں کو بہت اختلاف ہے۔

یہ خود اعتمادی خصوصاً اس اس وقت زیادہ قابلِ اعتراض لگتی ہے جب اس کا اظہار کرنے والے خود اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کی اصلاح کرنے سے قاصر رہے ہوں، حتٰی کہ ان کا اپنا کردار اور اخلاقی معیار قابلِ اعتماد نہ ہو۔

اس مغالطے یا مبالغے کی اصلاح ضروری ہے کہ آج کی دنیا میں قوموں کے اختلاف مذہب کی بنیاد پر ہیں۔ ہمارے چند ممالک کو چھوڑ کر کہیں بھی مذہبی رجحانات اتنے طاقت ور نہیں۔ آج کی دنیا معاشی مسابقت اور سیکولر حکومتوں کی دنیا ہے۔ صدر بش کے آخری دور میں امریکہ کی عدالت عالیہ نے عیسائیت کے نقطہ نظر سے لکھی ہوئی کتاب The Intelligent Design کو اس بنا پر سکولوں کے نصاب میں لگنے سے روک دیا تھا کہ بظاہر سائنس کی اس کتاب کے پیچھے وہ تحریک ہے جس کا اصل مقصد عیسائی نظریات کو سائنس میں داخل کرنا ہے۔ اور ایسی کتاب کو نصاب میں شامل کرنے سے امریکہ میں موجود دوسرے مذاہب کے لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اسی طرح امریکی سپریم کورٹ کے موجودہ چیف جسٹس کو حلفِ وفاداری لینے سے پہلے ایوانِ نمائندگان کی تفصیلی باز پرس سے گزر کر یقین دلانا پڑا

کہ وہ امریکہ کے آئین کو اپنے عیسائی نظریات پر فائق رکھے گا (امریکی آئین کی اہم شق ہے ''مذہب کی آزادی اور مذہب سے آزادی کا حق'')۔ کیونکہ صدر بش کے نامزد جج کی حیثیت سے اور اپنے قدامت پسند عیسائی نظریات میں مشہور ہونے کے باعث اس جج پر شبہ تھا کہ مملکت کے اہم ترین جج کی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر اس کے مذہبی میلانات اثر انداز ہوں گے۔ خود صدر بش کے مذہبی تعصب کے رجحانات پر شدید احتجاج ہوا تھا اور اس کی مذمت میں بیسیوں کتابیں لکھی گئیں۔ اور انہی مذہبی تعصبات کے باعث اور جنگی حکمت عملی کے سبب ری پبلیکن پارٹی کی مقبولیت کو سخت نقصان پہنچا تھا۔

جرات تحقیق www.RealisticApproach.org جرات تحقیق

مغربی تہذیب کا مغالطہ

ایک اور مغالطہ مغرب اور مغربی تہذیب کا ہے۔ مغرب تو ہمارے لئے ایران اور عرب بھی ہے کیونکہ یہ بھی مغرب میں ہیں۔ جاپان کے لئے چین اور روس مغرب ہیں اور بھارت کے لئے ہم مغرب۔ جغرافیائی اعتبار سے کسی تہذیب کو مغرب یا مشرق کہنا مہمل بات ہے۔ جہاں تک ایک اصطلاح کا تعلق ہے یعنی اس مفہوم کے طور پر کہ جو تہذیب یورپ میں پیدا ہوئی یا اب امریکہ میں ہے اسے مغربی تہذیب کہہ دیا جائے تو اب یہ اصطلاح بھی غلط ہو چکی ہے۔ ہر تہذیب کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ امریکہ، یورپ، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی سفید فام عیسائی آبادیوں کی شائد کچھ مخصوص ثقافتی و تہذیبی تشکیلات مشترک ہوں، لیکن اگر ان مخصوص تشکیلات کو ہم عیسائی مذہب سے خلط ملط کر دیں تو پھر یہ اس تہذیب کی شناخت نہیں، کیونکہ عیسائی تو پاکستان میں بھی ہیں، عرب دنیا میں بھی جو بالکل عربوں جیسے ہیں اور بھارت میں بھی ہیں اور انڈونیشا اور ملائیشیا میں بھی ہیں جب کہ ان سب عیسائی آبادیوں کی تہذیب اپنے اپنے علاقوں کی تہذیب ہے جس پر ان کے جغرافیائی تشخص کا اثر اتنا گہرا ہے کہ یورپ کینیڈا، امریکہ کی عیسائی آبادیوں کے ساتھ ان کی کوئی مشابہت نہیں۔

وہ جسے غلط العام میں مغربی تہذیب کہا جاتا ہے دراصل صنعتی جمہوری تہذیب ہے جو تحریک احیائے علوم اور تحریکِ حقوق کے بعد پیدا ہوئی اور جسے جدید صنعتی دور نے خصوصی شناخت فراہم کی۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہ تہذیب معاشی بنیاد پر دو بڑے دھاروں میں

تقسیم ہوگئی تھی، یعنی سرمایہ داری اور اشتراکی اصولِ معیشت کے دھارے۔ لیکن دونوں کا بنیادی نصب العین ایک ہی تھا: انسانی زندگی کو آسودہ بنانا اور تمام انسانوں کے لئے رنگ، نسل اور مذہب کے امتیاز کے بغیر برابر مواقع اور حقوق کی ضمانت فراہم کرنا۔ دونوں معاشی نظاموں کی اپنی اپنی کوتاہیوں کے باوجود پچھلی صدی علم و ہنر یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کی عظیم ترقی کی صدی تھی، جس میں سرمایہ داری کے نوآبادیاتی اور سامراجی تسلط سے نکل کر ایک عالمی انسانی معاشرہ وجود میں آیا ہے۔ یہ تہذیب انسانی فکر کا نتیجہ ہے، یہ مکمل ضابطہِ حیات ہونے کی دعویدار نہیں، لہٰذا اس میں ہر دم تبدیلی اور اصلاح جاری رہتی ہے۔ یہ تہذیب اب سفید فام عیسائی لوگوں تک محدود نہیں، بلکہ ہر اس قوم کی اب یہی تہذیب ہے جس نے جدید صنعتی معیشت، آزادیِ فکر اور انسانی حقوق کے تصور کو قبول کیا ہے۔ روس، جاپان، چین، مشرق بعید کے ممالک، بھارت اور لاطینی امریکہ سبھی اب اس تہذیب کے دائرے میں آ گئے ہیں یا آ رہے ہیں۔ گرچہ ثقافت کا فرق موجود ہے۔

اس تہذیب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیاد مذہب پر نہیں، نہ ہی مذہب کی مخالفت پر ہے بلکہ اس اصول پر ہے کہ انسانی زندگی کے اجتماعی معاملات کو انسانی علم اور تحقیق سے حل کیا جائے۔ آزادیِ فکر اور انسانوں کے حقوق کی برابری کا تصور اِسے پچھلے وقتوں کی تہذیبوں سے جدا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ عیسائی تہذیب نہیں، نہ ہندو، نہ بدھ تہذیب۔ جن قوموں نے پہلے پہل تحریک احیائے علوم کے انقلابی نظریات کو اپنایا وہ چونکہ مغرب میں تھے یعنی مسلمانوں کے مغرب میں تھے اور عیسائی مذہب سے وابستہ تھے، اس لئے وہ لوگ جن کو دیر تک اس تہذیب کی اصل خصوصیات سمجھ میں نہیں آئیں (شائد ابھی تک نہیں آئیں) وہ اسے مغربی تہذیب کہنے لگ گئے۔ ظاہر ہے کہ جب یورپ کے لوگ براعظم امریکہ پہنچے تو وہاں کی مقامی آبادی کے لوگوں نے انہیں مغربی نہیں کہا، کیونکہ وہ ان کے لئے مشرق سے آئے تھے۔ راجہ داہر اور دیبل کے ہندوں نے عرب سے آنے والے حملہ آوروں کو پچھمی یعنی

مغربی کہا ہوگا۔ جو کہ یقیناً جدید یورپی کے معنوں میں نہیں۔ اس روایتی اصطلاح کو اس شدت کے ساتھ جدید صنعتی تہذیب پر چپکا دیا گیا ہے کہ جاپان، چین، روس، بھارت اور دنیا کے ہر اس ملک کو ہم مغربی تہذیب اپنانے کا طعنہ دیتے ہیں جو جدید صنعت اور سائنس سے فیض یاب ہوئے ہیں۔

اس تہذیب کو نمایاں کرنے کے لئے ہم اسے جدید صنعتی جمہوری تہذیب کہہ سکتے ہیں، انسان دوست تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ یا سیکولر تہذیب بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ کسی ایک مذہب کی دوسرے مذہب پر فوقیت کا حق نہیں مانتی۔

اس جدید تہذیب کے دو واضح پہلو ہیں، ایک جسمانی یا مادی۔ دوسرا فکری۔ اس کے مادی جسمانی اثرات دنیا کے ہر ملک نے قبول کر لئے ہیں۔ کیونکہ یہ انسانی زندگی کو ایسی سہولتیں اور مواقع فراہم کرتی ہے جو سب کو اچھے لگتے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو اسے مغرب کی تہذیب کہہ کر اس سے شدید نفرت کا اظہار کرتے ہیں وہ بھی اس کے مادی اور جسمانی فیوض خوشی سے وصول کرتے ہیں۔ ریلیں، بسیں، موٹر کاریں، جدید شاہراہیں، عمارات، بجلی، اڑتے بہتے جہاز، ٹیلی فون اور رسل و رسائل، دفاتر میں میز کرسی کا استعمال اور کمپیوٹر، گھروں کے اندر ٹی وی، کوکنگ رینج، فریج، اے سی، پنکھے، کرسیاں صوفے اور انسانوں کے لباس میں ایک خاص انداز سے چستی کا پہلو، حلیہ میں رنگ و نسل کے فرق کے باوجود کالر اور بالوں کی مخصوص سی کاٹ اور اکثر اوقات پتلون یہ دنیا بھر میں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ سب کسی مذہب کی شناخت نہیں تھے نہ ہی پچھلی تہذیبوں میں یہ سب کچھ دکھائی دیتا تھا۔

دوسرا پہلو فکری ہے۔ دراصل یہ وہ پہلو ہے جس کی کاٹ بعض پسماندہ جاگیرداری / قبائلی معاشروں کو بری طرح ناپسند ہے۔ یہ نظریات جدید سائنس اور ٹیکنالوجی یعنی علم و ہنر کے ظہور اور ترقی کے لئے اٹل اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں تصور جمہوریت کا ہے۔ جمہوریت صرف الیکشن اور ان کے ذریعے نمائندوں کے چننے کا نام نہیں۔ جمہوریت کا

بنیادی مفہوم جو احیائے علوم کی تحریک نے سمجھا اور اپنایا، یہ تھا کہ تمام انسان برابر ہیں، تمام انسانوں کو برابر حقوق حاصل ہیں، ان حقوق میں انسانی آزادی، آزادیِ فکر، آزادیِ اظہار، آزادیِ مذہب اور آزادیِ تنظیم سب شامل ہیں۔ کسی گورے کو کالے پر، کسی مرد کو عورت پر، کسی ایک نسل کو دوسری نسل پر، کسی ایک مذہب کو کسی دوسرے مذہب پر فوقیت نہیں۔ رنگ نسل اور قومیتوں کے تعصبات مہمل اور باطل ہیں، بنی نوع انسان کی اس دنیا میں زندگی سب سے بڑی صداقت ہے، یہ زندگی مقدس ہے اور اس کے تحفظ کے لئے ساری انسانیت کی متحدہ جدوجہد ضروری ہے۔

اگرچہ یورپ کی اقوام نے ان شاندار نظریات کے باوجود دنیا بھر میں نوآبادیات قائم کیں اور قوموں پر تسلط جمایا، پھر آج کی دو بڑی جنگیں بھی انہی قوموں نے لڑیں لیکن فاشزم اور نوآبادیاتی نظام کے باوجود ان نظریات کی قوت ان معاشروں میں کم نہیں ہو سکی۔ بلکہ یہ نظریات دنیا بھر میں نوآبادیات کی آزادی کے لئے بنیاد بن گئے۔ اس جدید تہذیب نے انسانوں کی آزادی اور حقوق کو جس انداز سے تسلیم کیا اس کے نتیجہ میں یہ فطری تھا کہ ان کے معاشروں میں بعض مبالغہ آمیز ذاتی آزادیاں بھی رائج ہوئیں۔ خاندان کی شکست و ریخت اور اولاد کی اپنے والدین کے ساتھ حقوق کی برابری کے تصور نے بعض الجھنیں پیدا کیں لیکن یہ اس تہذیب کی بنیادی شناخت نہیں، نہ ہی اس تہذیب کے مفکروں کا اصرار ہے یا فلسفہ ہے کہ اس تہذیب کے یہ پہلو اپنائے جائیں۔ جو الجھنیں آزادی کے استعمال سے پیدا ہوئیں ان کے باوجود یہ معاشرے سلامت ہیں یا ان الجھنوں کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جاگیرداری دور کی وہ ظالمانہ فضیلتیں جو انسان پر انسان کے تسلط کی ضمانت دیتی ہیں اس نئے نظام کے آنے سے خطرے میں پڑ گئیں اور چونکہ مسلمانوں کی بادشاہتوں کا خاتمہ اس صنعتی معاشرے کے ہاتھوں ہوا تھا لہذا اقتدار سے محروم ہونے والے طبقوں کو اس کا بہت قلق تھا۔ غالباً یہ وہ بنیادی سبب ہے جس کے باعث مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا سہارا

لے کر اس تہذیب کو کبھی عیسائیت اور کبھی الحاد کی تہذیب کے طور پر نفرت کا نشانہ بنایا گیا۔

سیاسی سطح پر اس نئے نظام نے آزادی فکر، آزادی رائے اور حق رائے دہی کو رواج دیا جو جاگیرداری تسلط اور سرداریوں کی نفی تھا، جس کا لازمی نتیجہ تھا زیادہ سے زیادہ لوگوں کی اقتدار میں شرکت۔ انسانی حقوق کا جو تصور اس نظام فکر نے دیا اس میں کسی طبقے کی قانونی یا فطری برتری کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ یعنی ذات پات، قبائلی برتری، رنگ و نسل کے وہ امتیازات جو رسول اللہ ﷺ نے حجتہ الوداع کے خطبہ میں باطل قرار دیئے تھے اور جن کو عملی طور پر مسلم حکمرانوں نے بہت کم باطل کیا، وہ سب امتیاز اس صنعتی تہذیب نے عملاً باطل کر دیئے ہیں۔ اس نظام کے اندر آنے والا کوئی شخص تارکِ وطن ہو یا عارضی قیام پذیر، ملکی قانون سے حاصل ہونے والے ہر حق سے مستفیض ہوتا ہے۔ جو کہ سعودی عرب یا کسی دوسرے قبائلی معاشرہ میں ممکن نہیں۔

کوئی نظام عملاً اپنے فلسفہ پر مکمل طور پر پورا نہیں اترتا۔ یہ کوتاہی اس میں بھی ہے۔ لیکن اس نظام میں جو بات پہلے سماجی نظاموں سے جدا ہے یا شائد بہتر بھی، وہ یہ ہے کہ یہ غلطی کو قبول کرنے، اس کا ازالہ کرنے اور مسلسل آگے بڑھنے کو قبول کرتا ہے، اور تسلیم کرتا ہے کہ معاملات انسانی فکر سے حل ہوں گے اور چونکہ انسانی فکر کبھی مکمل اور آخری نہیں ہوتی لہذا اس میں نشوونما کی ضرورت رہتی ہے۔ اور یہ ضرورت صرف انسانوں کی مسلسل کاوش سے ہی پوری ہوسکتی ہے۔ یہ تہذیب فرد کی آزادی کا اصول تسلیم کرتی ہے۔ صرف اس شرط کے ساتھ کہ ایک شخص کی آزادی کسی دوسرے کی آزادی میں حائل نہ ہو۔ یہ تہذیب قانون کے سامنے ہر شخص، یعنی مرد عورت، مسلم غیر مسلم، کی برابری اور زندگی کے ہر شعبے میں قانون کی عملداری کو شرطِ اول مانتی ہے۔ یہ فرد سے زیادہ اداروں کی حکمرانی کا تصور مانتی ہے اور فرد اور اداروں کے اقتدار کی مدت کا تعین ضروری قرار دیتی ہے۔

انسانی حقوق کا یہ تصور یقیناً قبائلی اور جاگیرداری معاشروں سے مختلف تھا اور شائد

متصادم بھی۔ عورت کی آزادی مردانہ تسلط کے معاشروں میں یقیناً گالی کی طرح تھی، جہاں عورت کا مقام زیرکاشت زمین کے برابر تھا، چنانچہ جب فرد کی آزادی کا اصول عورت پر بھی لاگو ہوا تو شروع میں یورپ سمیت صنعتی معاشروں میں بھی اس کے خلاف زبردست مزاحمت ابھری۔ مردانہ غیرت کی نفسیات جو صدیوں کے قبائلی اور جاگیرداری نظاموں کا ترکہ تھی، انیسویں صدی تک خود یورپ اور امریکہ میں موجود تھی۔ حیوانی نر کی وہ نفسیات جو دوسرے نر کو ابھرنے نہیں دیتی، دیر تک نام نہاد مغربی معاشروں میں اسی طرح غالب تھی جیسے ہمارے ہاں ابھی تک ہے۔ عصمت اور حیا کے جو تصورات ہمارے ہاں غالب ہیں ویسے ہی وہاں بھی تھے کیونکہ یہ مرد کی دی ہوئی وہ پابندیاں ہیں جو عورت کو مرد کے تابع رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ صوفے کی ٹانگوں کو ننگا دیکھ کر یورپ کی حیادار بیگمات کا بے ہوش ہو جانا انیسویں صدی تک ایک فخریہ پیش کش سمجھا جاتا تھا اور پرائی عورت کو دیکھ کر مونچھوں کو تاؤ دینے والے مرد کو یہاں کے رسم ورواج کی طرح وہاں بھی دوسرے مرد سے غیرت کے نام پر موت کا کھیل کھیلنا پڑتا تھا جسے Dual کہا جاتا تھا۔ مذہبی رہنماؤں نے نئے نظام کے مفکروں کو کافر اور ملحد کا درجہ یورپ میں بھی عطا کیا، روس چین اور جاپان میں دیر تک اور بھارت میں ابھی تک ہندو مسلم دونوں مذاہب کے علما کو عورت کی آزادی اور سائنس دان کے خیالات سونے نہیں دیتے۔

ہمارے ہاں اس انسان دوست تہذیب کو جو لوگ مغربی یا عیسائی تہذیب کہتے ہیں ان میں دو طرح کے عناصر شامل ہیں، ایک وہ جو اس تہذیب کے جدید اثرات سے خائف ہیں کیونکہ ان کے مفادات کو اس تہذیب کے طاقتور ہونے سے شدید نقصان پہنچے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی طاقت دوسرے انسانوں کو غلام یا بے ہوش بنائے رکھنے میں ہے۔۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ان عناصر نے اس نئی تہذیب کو بے اثر کرنے کے لئے اسلام کا نام استعمال کیا اور اپنی عمدہ روایات کا واسطہ دے کر لوگوں کو اس تہذیب سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ دوسرے وہ معصوم اور کم علم لوگ جو پہلے گروہ کی پراپیگنڈہ مہم سے متاثر ہو کر انسان

دوست تہذیب سے متنفر ہوئے ہیں۔

بعض جدید مغربی معاشروں کی خاص خاص کمزوریوں کو اس طرح اچھالا گیا جیسے انسان دوست تہذیب کی بنیادی شناخت ہی یہ ہیں۔ مثلاً بزرگوں سے بعض نوجوانوں کی لاتعلقی، بعض لوگوں کی بے لگام جنسی زندگی، چند لڑکیوں کی عریانیت کو جدید تہذیب کے طور پر پیش کیا گیا جسے یہ تہذیب صرف اس لئے جگہ دیتی ہے کیونکہ فرد کو اپنی زندگی جینے کا حق ہے۔ لیکن معاشرہ ان چند لوگوں کے طرز حیات کو اجتماعی طور پر نہیں اپناتا اور نہ ہی ان چند لوگوں کے خلاف تشدد کی کوئی تحریک اٹھانا ضروری سمجھتا ہے۔ ان باتوں کا تذکرہ بڑھا چڑھا کر کرنے والوں کا مقصد صاف ہے۔ وہ عام لوگوں کو انسان دوست تہذیب کی اصل نعمتوں سے محروم رکھنا چاہتے ہیں اور اس مقصد میں ابھی تک کامیاب ہیں۔ کیونکہ ہمارے معاشرہ کے مڈل کلاس طبقہ کو اپنے فریبِ نظر Deception میں پھنسانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

یہ دلچسپ حقیقت کسی سے چھپی ہوئی نہیں کہ یہ لوگ جدید انسان دوست تہذیب کی پیدا کی ہوئی تمام مادی نعمتوں سے مالا مال زندگیاں گزارتے ہیں۔ ''مغرب'' کی جدید ترین ایجادات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، یعنی اپنے ''مغربی'' دشمنوں کو مارنے کے لئے ''مغرب'' کے جدید ترین ہتھیار اور وسائل رسل و رسائل، نقل و حمل، جنگی منصوبہ بندی کے لئے ''مغرب'' کے جنگی نظریات اور سیٹلائٹ فون، اپنی اولادوں کی تعلیم کے لئے ''مغرب'' کی بہترین درسگاہیں اور علاج کے لئے ''مغرب'' کے ہسپتال اور ڈاکٹر اور ادویات۔ ظاہر ہے عوام کو بھی جدید دور کی مادی نعمتوں سے دور رکھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ لہذا پورے کے پورے معاشرے ظاہری زندگی میں جدید انسان دوست تہذیب کے نمونے نظر آتے ہیں۔

لیکن وہ اصل قوت جس نے انسان دوست تہذیب کو یہ سب کچھ تخلیق کرنے کی صلاحیت دی ہے وہ طرزِ فکر ہے جس نے تاریخ انسانی میں پہلی بار انسان کو اپنی تقدیر خود لکھنے کا حق دیا ہے۔ یہی وہ قوت ہے جسے ہمارے معاشرے کے فائز اور مسلط طبقے ہمارے عوام تک

آنے نہیں دیتے، یعنی انسان اور کائنات اور انسانی سماج کے بارے میں وہ افکار جن سے انسان دوسرے انسان کی غلامی سے آزاد ہو کر اپنی ذات اور انسانیت کے لئے موثر کردار ادا کرتا ہے۔

اس طرزِ فکر کو مختصر ترین الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں: جاننا انسان کی فطرت ہے، جاننا انسان کا حق ہے، جاننا انسان کے لئے ممکن ہے، جاننا علم کو جنم دیتا ہے۔ علم کی درست شکل وہ ہے جو بنی نوع انسان کی زندگی اور بقا کے لئے مفید ہو۔ مفید علم وہ ہے جو معاشرے کی اجتماعی زندگی میں عملی طور پر مفید ثابت ہو۔ ایسا علم تب ہی علم بنتا ہے جب آزمائش میں صحیح نکلے۔ سچائی اور صحیح علم انسان کی اجتماعی محنت سے پیدا ہوتا ہے اور انسان کی اجتماعی ملکیت ہے۔ کسی بھی خیال یا نظریہ سے اختلاف کرنے میں برائی نہیں، بلکہ یہ انسانی ذہن کی نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ اختلاف سے گزر کر اتفاق تک آنا ہی اتفاق کی جائز شکل ہے، نہ کہ جبراً قائم کیا ہوا اتفاقِ رائے۔ انسان پر انسان کا تسلط یا جبر حرام ہے۔

انسان ابھی تک وہ نظام تلاش نہیں کر سکا جس میں انسان پر انسان کا تسلط مکمل طور پر ختم ہو جائے۔ لیکن ایسے نظام کی تخلیق انسان کی فکری کاوش اور جمہوریت کے ذریعے یعنی سبھی انسانوں کی شمولیت سے ہی ہوگی، کیونکہ ذہنِ انسانی پوری نوعِ انسانی میں بکھرا ہوا ہے، یہ کسی ایک گروہ یا علاقے میں سمٹا ہوا نہیں۔ کائنات کی تسخیر جو خدا کا وعدہ ہے، انسان تبھی کر سکے گا جب پوری نسل انسانی کے سارے فرد شرفِ انسانیت حاصل کر لیں گے یعنی حیوانی ضرورتوں سے بے نیاز ہو کر سوچنے کے قابل ہوں گے۔ تب انسان یعنی وہ آدم مکمل ہوگا جسے اللہ نے خلیفہ بنایا تھا۔

سائنس، جمہوریت اور انسانی حقوق کی وہ تحریک جو علم و ہنر کے انقلاب سے پیدا ہوئی ہے، آہستہ آہستہ پھیلتی ہوئی آخر ہر معاشرے پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ زندگی کو آسان بنانے کی جدوجہد غار کے زمانے سے انسان کی فطری جدوجہد رہی ہے۔ اس کے رستے

روکنے کی کوشش صرف انتشار پیدا کرسکتی ہے، وقتی اور محدود پیمانے پر جمود بھی ممکن ہے لیکن اسے روک دینا یا واپس کر دینا ایسے ہی ناممکن ہے جیسے جوان کو واپس بچہ بنا دینا۔ انسانی فطرت حیوان کی فطرت سے یکسر مختلف ہے۔ حیوان کائنات کی فطرت کے ماتحت زندگی بسر کرتا ہے، نسل در نسل ایک سی زندگی گزارتا ہے، اس کے رویوں کا تغیر لاکھوں سال کا محتاج ہوتا ہے پھر بھی فطرت سے سرکشی کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ انسان کائنات کی فطرت سے باغی ہے یہ مجبوری اور مجبوری کے مطابق ڈھلنے سے نفرت کرتا ہے۔ فطرت کو بدلنا چاہتا ہے، خود اپنی فطرت کو بھی بدلتا ہے، فطرت کو اپنی اطاعت پر مجبور کرنے کا خواب دیکھتا ہے۔

شمولیت اور انفرادیت کے انسانی تصورات، خود ہی شاہد و مشہود ہونے کی صلاحیت، خود اپنے سمیت کائنات کو بدل دینے کی قوت، وہ انسانی جوہر ہیں جو عالم موجود و معلوم میں منفرد ہیں۔ تہذیبوں کا ارتقا آخر کار ایک عالمی انسانی تہذیب کی صورت اختیار کر رہا ہے جس کی بنیاد انسان کے یہی منفرد جوہر ہیں۔

آج کی تہذیب کے نقاد پوچھتے ہیں کہ کیا آج کے جدید انسانی معاشروں کی ترقی حقیقی ترقی ہے؟ یہ سوال ایک عرصہ دنیا بھر کے سنجیدہ مفکروں اور اہل علم کی بحثوں کا موضوع رہا ہے۔ اور ہمارے ہاں ابھی تک ہے: رفتار کی تیزی یا ہواؤں میں اڑنا، خلاؤں کہکشاؤں کو دیکھنا اور ان کے فاصلوں اور عمروں کا تعین کر لینا، انسانی جسم اور انسانی ذہن کا مطالعہ کر لینا، اسے سمجھ کر مصنوعی ذہانت کے آلات تخلیق کرنا اور حیرت میں ڈالنے والی بہت ساری باتیں کیا بذاتِ خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہم نے ترقی کی ہے۔ ممکن ہے روحانی طور پر ہم کمزور ہوئے ہوں، ہماری بہت سی خوبیاں آج کی سہولتوں کی وجہ سے کمزور ہو گئی ہوں، بہت سے علاج نکلے ہیں تو شائد بیماریوں کی تعداد اور پیچیدگی میں اضافہ بھی ہوا ہو، رفتار اور تعداد نے ہمارے اعصاب کو نشانہ بنایا ہو۔ ترقی کے حق میں بولنے والوں کو یہ سوالات نظر انداز کرنا آسان نہیں لگتا۔

لیکن وہ دو باتیں جو پچھلی چار صدیوں کے علمی سفر نے ممکن بنائی ہیں، اس تہذیب کو جواز دیتی ہیں: (۱) علم اور تہذیب تک سبھی کی رسائی اور سبھی کی شمولیت، جس کے نتیجے میں کائنات اور حیات پر حاصل ہونے والے علوم اور مفاہمت کا کلچر عام ہوئے ہیں، یہ علوم اور برداشت کے اصول ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہوتے اور ایک علاقہ سے دوسرے تک پھیلتے پھیلتے بالآخر بنی نوع انسانی کی مشترکہ ملکیت بن رہے ہیں۔ (۲) بنی نوع انسان کی بقا کی ضمانت، کہ سائنس اور ٹیکنالوجی یعنی علم و ہنر کی اس تہذیب نے یہ ممکن بنایا ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے باوجود وسائل کو ضرورتوں کے مطابق بڑھایا جا سکے یا رضا کارانہ طور پر آبادی کے اضافے کی تنظیم کی جائے اور خوف ناک ترین آلاتِ تباہی کے باوجود دنیا کو تباہی سے بچایا جا سکے۔ جینیاتی انجنئرنگ، سرن میں آغازِ کائنات کے رموز کی ریسرچ، جس سے توانائی اور عناصر کی تخلیق کا عمل سمجھنے کے راستے کھلیں گے، جینوم جس سے امراض اور معذوریوں کا یکسر نیا طریقہ علاج دریافت ہوا ہے، توانائی کے انقلابی وسائل کی دریافت۔ اور سب سے بڑھ کر انسانی دماغ کے ان افعال تک رسائی جو مسائل کے یقینی حل کی ضمانت دیتے ہیں۔ یہ وہ چند بڑی کامیابیاں ہیں جو علم و ہنر کی اس تہذیب کو تاریخی اعتبار سے جائز بناتی ہیں۔

آئندہ دو صدیوں میں انسانی آبادی غالباً سوارب سے تجاوز کر جائے گی۔ اتنی بڑی انسانی آبادی اور اس کے ساتھ نباتات اور حیوانات کی آبادی کے دوسرے مسائل کو تو چھوڑیں، شاید پانی کے وسائل ہی ناکافی ہو جائیں۔ ممکن ہے پانی پیدا کرنا پڑے، یعنی ہائیڈروجن اور آکسیجن بنانی پڑے، یعنی عناصر کی تخلیق کا طریقہ ایجاد کرنا پڑے۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ مسائل کی پیش گوئی بھی علم کے فرائض میں شامل ہے جن کا حل اٹل مجبوری ہے۔ مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت انسان کی اس بنیادی فکر سے پیدا ہوتی ہے کہ ہمیں اس دنیا میں رہنا ہے اور اسے رہنے کے قابل بناتے رہنا ہے، اور یہ کہ ہم جان سکتے ہیں اور ہمیں

جاننے کا حق ہے۔ اور یہ کہ اپنی اس دنیا کے مادی معاملات کا حل خود ہم نے نکالنا ہے، جس کے لئے اصول حیات بھی ہم نے خود طے کرنے ہیں۔ لیکن صرف وہ حل ہماری دنیا اور ہماری نسلوں کو بچا سکتے ہیں جو دنیا بھر کے لوگوں کو قبول ہوں۔ مسلط کئے گئے افکار و نظریات تصادم کو جنم دیتے ہیں۔

تصادم تباہی کی طرف جاتا ہے۔ کوئی قوم دوسروں کو فتح کر کے چین سے بیٹھ نہیں سکتی۔ پچھلے وقتوں میں اگر کچھ دیر کے لئے ایسا ہوا بھی تھا تو آج کی دنیا میں ممکن نہیں۔ فتح اگلی جنگ کو جنم دیتی ہے۔ جانوروں اور انسانوں کی جنگ بنیادی طور پر مختلف ہے۔ جانوروں میں تسلط کی جنگ فیصلہ کن ہوتی ہے کیونکہ 1) یہ انفرادی ہوتی ہے۔ 2) یہ ایک کی شکست کے بعد ختم ہو جاتی ہے، لیکن انسانوں میں ایسا نہیں۔ انسانوں کی نسلیں پچھلی شکست کا حساب چکاتی ہیں یا آزادی مانگتی ہیں کیونکہ انسانوں کے ہاں شعوری تاریخ کا عنصر ہمیشہ موجود رہتا ہے اور انسانوں کی جنگیں ہجوم کی جنگ ہونے کے باعث وسیع اور مسلسل تباہی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ یہ غلط ہے کہ تسلط اور غلبے کے لئے جسمانی تسلط ضروری ہے۔ اگر تسلط ضروری ہے تب بھی انسانوں کا غلبہ صرف فکری سطح پر رہ سکتا ہے۔ انسانی فطرت جانور کی فطرت سے یوں بھی مختلف ہے کہ یہ حقیقی وقت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ یعنی اتنے وقت میں کہ مسائل انسان پر حاوی نہ ہوں بلکہ انسان مسائل پر قابو پا سکے۔

فاتح کی تعظیم اور زورِ بازو کا فخر اُس دور کا ورثہ ہیں، جب انسان کی فطرت خونخوار جانور سے قریب تر تھی۔ انسانوں کو شیروں، شاہینوں اور طوفانوں سے تشبیہ دینے کا رواج اسی دور میں عام ہوا، جب چھین لینے والے اور تخلیق سے عاری طبقے حکمران اور فائز تھے، انسانی فطرت کا یہ مرحلہ ابھی گذرا نہیں، بار بار پلٹ کر سکہ جماتا ہے، لیکن یہ قائم رہنے والی سچائی نہیں۔ اس کا ثبوت عالمی سطح پر ابھرتی اور بڑھتی ہوئی وہ ناگواری ہے جو اکثریتِ عوام کو جنگ اور بدامنی سے ہے اور جس کا پُرزور اظہار دورِ جدید کے ہر سنجیدہ مفکر نے کیا ہے۔ آج دنیا

میں ایک بھی مفکر، سائنس دان یا شاعر ایسا نہیں جو حملہ آور فاتح کی تائید کرے، جبکہ علاقے فتح کرنے کا ایک زمانہ وہ تھا کہ ایک بھی ایسا نہ تھا جو فاتح کی تائید اور تعظیم سے انکار کرتا۔۔

اب وقت کا اسمِ اعظم تخلیقی شمولیت اور خدمت ہے۔ تعظیم کے حقدار وہ سائنس دان اور محقق اور مفکر ہیں جو زندگی کی حفاظت اور آسودگی کے لیے راستے بناتے ہیں۔

علم و ہنر انسان کی مشترکہ میراث ہیں جس کی تعمیر میں بنی نوع انسان کے شاندار بیٹوں اور بیٹیوں کی ان گنت قربانیاں صرف ہوئی ہیں۔ کوئی قوم، قبیلہ یا طبقہ دوسرے پر فائق نہیں، فضیلت صرف علم کی ہے، علم جو انصاف ہے، عدل ہے، سچائی ہے اور اس یقین کا دوسرا نام ہے کہ کائنات بنی آدم کے لئے قابل تسخیر ہے۔ یہ ساری کامرانیاں جو آج کے علم و ہنر کی صورت میں انسان کو نصیب ہوئی ہیں اور ہونے والی ہیں، یہ عالمی تہذیب جس نے نسل انسانی کو متحد ہو کر جاننے اور کائنات کو فتح کرنے کی صلاحیت دی ہے، شاید خود خالقِ کائنات کی منشا ہے، لہذا اسے پورا کرنے کے لئے اور ان کوتاہیوں کو دور کرنے کے لئے جو ابھی اس عمل کی راہ میں حائل ہیں مسلمانوں کو کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔

Jurat-e-Tehqiq

سیکولرازم کا مغالطہ

سیکولرازم کو الحاد یا کفر یا لادینی نظریہ کے طور پر مشہور کر دیا گیا ہے جو ایک زبردست مغالطہ ہے۔ عظیم مسلم مفکر ابن رشد کو سیکولر طرزِ فکر کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ جس نے اندلس میں ارسطو کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ صداقت تک پہنچنے کے کم سے کم دو راستے ہیں: مذہب کا راستہ اور فلسفہ کا راستہ۔ یوں اس نے پہلی بار مسلم معاشرہ میں فلسفہ کو مذہب سے جدا کر کے سیکولر یعنی دنیاوی طرزِ فکر پیش کی۔

جدید دور میں اس اصطلاح کا موجد برطانوی مصنف جارج ہولی اوک ہے جس نے 1846ء میں عیسائی علما کے تسلط اور مداخلت کے دور میں انسان کے دنیاوی مسائل کو دنیاوی دانش کے ذریعے حل کرنے کا نظریہ پیش کیا۔ اس نے وضاحت کی کہ یہ طرزِ فکر دین کو انسانی زندگی سے خارج کرنے کے لئے نہیں بلکہ انسانی فکر کو انسانی زندگی میں جگہ دلانے کے لئے ہے۔ اس نے کہا کہ سیکولرازم یہ نہیں کہتا کہ روشنی اور ہدایت دین میں نہیں بلکہ یہ کہتا ہے کہ روشنی اور ہدایت انسانی فکر میں بھی ہے۔

یہ ایک اہم غلط فہمی ہے کہ سیکولر سے مراد وہ طرزِ عمل یا طرزِ فکر ہے جو مذہب کی نفی کرتی ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ سیکولر طرزِ فکر عملی زندگی کے تجربے سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً علم سیکولر ہے، ہنر سیکولر ہے، کائنات سیکولر ہے یعنی کائنات اور اس میں جاری و ساری قوانین اللہ کے بنائے ہوئے ہو کر بھی سیکولر ہیں۔ یعنی یہ کسی مذہب کے پیدا کردہ اصول

نہیں۔ فطرت اور انسانی زندگی کے ان گنت سلسلے ایسے ہیں جن کا مطالعہ نہ مذہبی ہے نہ مذہب مخالف۔ مثلاً فطرت کے قوانین یعنی فزکس اور نباتی اور حیوانی حیات کے قوانین، تاریخ اور جغرافیہ کے حقائق، اقوام عالم کے باہم روابط، ذہن کی کارکردگی کے قوانین، مادی وسائل کی تنظیم کا مطالعہ، غرضیکہ وہ تمام حقائق جن کا تعلق انسان کے مشاہدے اور تجربے سے ہے، ایسے معاملات جن پر مذہب رائے دیتا ہے، لیکن ان کا ادراک دین کے مطالعہ سے مکمل نہیں ہوتا، ان کا مطالعہ انسانی ذہن کا عمل ہے۔ یعنی انسانی عقل کے استعمال سے ہم نہ صرف دین کے معاملات کا ادراک کرتے ہیں بلکہ چاہے دین کی روشنی میں ہی دنیا کا مطالعہ کرنا چاہیں تب بھی اپنے فہم کو استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً قرآن نے کہا کہ اللہ نے زمین و آسمان چھ دن میں بنائے لیکن یہ مان لینے کے بعد فلکی طبیعات اور کششِ ثقل اور کائنات کا نظریہ اضافی یعنی فطرت کے قوانین کی ان گنت معلومات انسانی عمل کے ذریعے حاصل ہوئیں۔

ایک اور مثال: قرآن میں ہے کہ ہم نے یعنی اللہ نے لوہا نازل کیا جس میں لوگوں کے لئے کثیر فائدے ہیں۔ سیکولر طرز فکر کا عملی اطلاق اس صورت میں یوں ہے کہ ہم پہاڑوں میں لوہے کا پتھر ڈھونڈتے ہیں جو کہ کان کنی کا علم ہے۔ پھر لوہا تیار کرنے کا جدید علم اور ہنر سیکھتے ہیں جس میں ہم نے دھاتوں کے کیمیاوی اصول، عناصر کی رغبت کے اصول اور فولاد بنانے کے لئے حدت کے قوانین معلوم کئے ہیں۔ اس علم کے ساتھ ہم ایک اور علمی شعبہ یعنی برقی آلات کے اصول اور تیاری کا علم حاصل کرتے ہیں۔ پھر ہم فولاد سازی کا علم، کیمیاوی علم اور برقی آلات سے حدت پیدا کرنے کا علم اور ہنر ملا کر کئی قسم کا کروڑوں ٹن فولاد تیار کرتے ہیں۔ فولاد کی طاقت کو ناپنے کے لئے پیمانے بنانے کا علم و ہنر سیکھتے ہیں۔ پھر اس فولاد کو عمارتوں، ہتھیاروں، گاڑیوں اور لاتعداد دوسری شکلوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اور ان مختلف چیزوں کی ایجاد اور انہیں بنانے کا ہنر سیکھتے وقت نہ تو ہم کسی مذہبی اصول کی تردید کرتے ہیں اور نہ ہی تائید۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ ہمارے اس علم کا غیر جانبدار رہنا کسی بھی مذہب کی نفی

نہیں کرتا۔

جن سائنسدانوں اور انجینئرز نے یہ علوم وفنون آگے بڑھائے وہ اس عمل میں نہ تو اسلامی تھے نہ مسیحی نہ ہندو، مگر پوری یکسوئی سے ان کی کاوش کا مقصد لوہا تیار کرنا تھا۔ پاکستان کی سٹیل ملز کی تعمیر اور تکمیل کے مراحل میں روسی اور پاکستانی انجینئرز ملکر کام کر رہے تھے۔ وہ اگر اس کام کے دوران اپنی اپنی مذہبی عبادات بجالاتے تھے تو اس سے ملز کی تعمیر وترقی کے کام میں کوئی خلل نہیں آیا نہ ہی اس ملز کی تعمیر یا اس کے ڈیزائن میں روسی انجینئرز کا لامذہب ہونا ہمارے دینی عقائد میں کسی خلل کا باعث بنا۔ لیکن یہ واضح ہے کہ ملز کا کام کرتے وقت سبھی کارکن اور سائنس دان صرف فولاد سازی کے اس منصوبہ سے دلچسپی رکھتے تھے جبکہ ان کے مذہبی عقائد کا اس میں کوئی دخل نہ تھا۔

اب اس کے برعکس دیکھیں وہ طرز فکر جس کا نقطۂ آغاز اور آخری مقصد کسی مذہبی عقیدے کی ترویج ہے: انٹرنیٹ پر ایک ویب سائٹ میں جوشیلے مسلمان نوجوانوں نے لوہے والی آیت کا ذکر کرتے ہوئے ریسرچ کا استعمال یوں کیا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ جدید سائنس میں لوہے کا جوہری وزن 56 ہے۔ جبکہ حدید والی آیت کے اعداد گنیں تو وہ بھی 56 ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ یہ دین اسلام کی سچائی کا واضح ثبوت ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے ایسی آیت آئی۔ اس طرز فکر پر دوسرے اعتراضات سے پہلے اہم ترین بات یہ ہے کہ اس طرزِ فکر سے لوہا بنانے کے علم و ہنر میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ یہ موافقت تلاش کر لینے سے کہ آیت کے عدد بھی 56 ہیں اور جدید سائنس میں لوہے کے عدد بھی 56 ہیں، لوہا بنانے کے کام میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ مزید برآں اس طرح کے استدلال میں قباحت یہ ہے کہ قرآن کی وہ آیت جس میں سونے اور چاندی کا ذکر ہے، لفظوں کی تعداد کے اعتبار سے سونے اور چاندی کے جوہری اعداد سے ہم آہنگ نہیں۔ لہٰذا یہ تھیوری کہ جدید سائنس کے قاعدے اور فارمولے قرآنی آیات میں لکھے ہوئے ہیں زیادہ آگے نہیں بڑھتی۔ لہٰذا اس قسم کے استدلال سے

انسانی زندگی کو کچھ حاصل ہونے کے بجائے وقت کا زیاں ہوتا ہے، انسانی ذہن حقیقت کو سمجھنے کی بجائے وہم کے پیچھے چل پڑتا ہے، جس سے اختلاف اور ٹکراؤ کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جب دو مذاہب کے لوگ اپنے اپنے عقاید کو ثابت کرنے میں لگ پڑتے ہیں تو سامنے رکھے ہوئے حقائق کو سمجھنا اور مسائل کو حل کرنا ممکن نہیں رہتا۔

اس طرح کے دلائل سے مذہب کی صداقت ثابت کرنے میں مدد ملتی ہے یا نقصان ہوتا ہے، اس سے قطع نظر یہ واضح ہے کہ یہ مذہبی طرزِ فکر کا ایک ایسا نمونہ ہے جس سے علم و ہنر کے بارے میں ہمارے جذباتی رویے صاف ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض ٹی وی چینلز پر کچھ حضرات سائنس کے جدید علمی انکشافات کو قرآن کی آیات کے ثبوت میں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ یہ خیال یا دعوے کہاں تک صحیح ہیں یا غلط، ان مثالوں سے یہ واضح ہے کہ قوانینِ فطرت کو مذہبی نظر سے دیکھنے والوں کی دلچسپی اس امر سے نہیں ہوتی کہ یہ قوانین فطرت کیسے معلوم کئے جائیں یا یہ کہ ان کو سیکھا اور استعمال کیا جائے بلکہ ان کو اس سے دلچسپی ہوتی ہے کہ وہ علم جو دوسروں نے عملی دنیاوی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے حاصل کیا، اسے بھی صرف عقیدہ کو مضبوط کرنے کے لئے پیش کیا جائے۔ یوں لگتا ہے کہ دینی معاملات میں شدت سے منہمک حضرات عملی زندگی کے مسائل حل کرنے میں کوئی دلچسپی ہی نہیں رکھتے۔ اس طرزِ فکر پر اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ علم و ہنر کو مذہبی نظر سے سیکھنے والے لوگ کئی صدیوں کے دوران خود علم و ہنر میں کوئی اضافہ نہیں کر سکے بلکہ اب تک جو کچھ ایجاد ہو کر انسان کی ترقی و خوشحالی میں لگا ہوا ہے، وہ سب سیکولر کارندوں کی لگن کا پھل ہے، چاہے یہ سیکولر کارندے مضبوط دینی عقائد والے تھے یا لامذہب۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا سیکولر نظام مملکت میں مذہب کا خاتمہ ہو جاتا ہے؟ جن ملکوں میں سیکولر نظام رائج ہے وہاں نہ تو مذہب کا خاتمہ ہوا ہے نہ ہی لوگوں کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے سے روکا گیا ہے۔ دنیا کے درجنوں ممالک میں صدیوں سے سیکولر طرز حکومت رائج

ہے۔ ان میں سے کئی آبادیوں کا مذہب عیسائیت ہے، جسے کسی پابندی کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ جو مسلم آبادکار ان ملکوں میں آباد ہوئے انہیں بھی اپنے عقائد پر عمل کرنے اور ان کی تبلیغ کرنے سے روکا نہیں گیا۔

اس کے برعکس پاکستان کے اسلامی جمہوریہ بننے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج یہاں مذہب کے نام پر غدر برپا ہے، فرقہ ورانہ تصادم ہے، حتیٰ کہ طالبان کا ظہور ہوا ہے جنھوں نے مملکت کی جڑوں پر وار کئے ہیں، پاکستان کی سرحدوں کو ماننے سے انکار کیا ہے، ملک کا متفقہ آئین مسترد کیا ہے اور پاکستان کے مسلم عوام کو خارج از اسلام قرار دیا ہے۔ مولانا صوفی محمد، بیت اللہ محسود اور مولوی فضل اللہ جیسے لوگوں کی رائے بلاشبہ ان کا حق ہے اور یہ حق جمہوریت کا حصہ ہے۔ لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کے عوام کا متفقہ آئین مسترد کرنے کا اور مملکت پر عوام کی رائے کے بغیر جبراً قبضہ کرنے کا حق ان کو اس لئے حاصل ہے کہ وہ اسلام کے نمائندہ ہیں اور انہیں اپنی یہ نمائندگی ثابت کرنے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں، غدر اور انتشار ہی کافی ہے۔ ایسے لوگ ہماری نسلوں کو علم و ہنر سے متنفر کرنے میں صرف اس لئے کامیاب ہوئے ہیں، کیونکہ مملکت نے اسلام سے کمٹمنٹ کر کے ہر اس شخص کے آگے اپنے ہاتھ باندھ لیے ہیں جو اسلام کا خودساختہ نمائندہ بن کر اس پر چڑھ دوڑے۔

مذہب کو جبراً نافذ کرنے کے حق میں ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ اللہ کا دیا ہوا نظام ہے، اس لئے اس کے نفاذ میں کسی انسان کی رائے جاننے کی ضرورت نہیں اسی استدلال کو مولانا مودودی نے اپنے رسالہ ''ارتداد کی سزا'' میں اور بعدازاں سید قطب نے اپنی کتاب "معالم فی الطریق" میں آگے بڑھا کر اس عزم کا اظہار کیا کہ اسلام کے علاوہ دنیا کے ہر نظام کو قوت کے ذریعے ختم کر دیا جائے گا، اور جب ساری دنیا اسلام کی حکومت کے ماتحت آجائے گی تو پھر لا اکراہ فی الدین کا اصول نافذ ہوگا۔ یعنی پہلے جبر کے ذریعے اسلام نافذ ہوگا، پھر لوگوں سے کہا جائے گا کہ مذہب میں کوئی جبر نہیں۔

یہ طرز فکر عملی طور پر کس قدر ناقص اور تباہ کن ہے، اس سے قطع نظر یہ فکری اور اصولی سطح پر بھی اتنا ہی ناقص نظر آتا ہے۔ خود انبیا کی مثال اس کی تردید کرتی ہے۔ کوئی نبی ایسا نہیں آیا، جس کا دین طاقت سے نافذ ہوا ہو۔ ہر رسول لوگوں کو ترغیب و تبلیغ کے ذریعہ سے اپنی طرف بلاتا رہا۔ گویا یہ اختیار جمہور کا تھا کہ وہ اپنی رضامندی اور رغبت سے پیغام کو قبول کریں یا نہ کریں۔ حضرت یونس علیہ السلام کی مثال اس سلسلے میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے، جو قرآن نے شاید اسی نکتہ کی وضاحت کے لئے بیان کی ہے۔

قرآن کے مطابق انہوں نے اللہ سے استدعا کی کہ ان کی قوم کو سزا دی جائے۔ یعنی اللہ اپنی قدرت کا استعمال کر کے حضرت یونسؑ کی سچائی ثابت کرے۔ اللہ نے ایسی سزا کا وعدہ بھی کر لیا، لیکن جمہور کی توبہ سن کر اللہ نے سزا کو منسوخ کر دیا جس کا اعلان حضرت یونس نے اللہ کی مرضی سے کر دیا تھا۔ اس کے باوجود جب آپ اللہ سے شاکی ہوئے تو آپ کا احتجاج آپ کے لئے آزمائش کا باعث بن گیا، یعنی اللہ نے اپنے نبی کو سرکشی کی سزا دی، جب کہ عوام کو معاف کر دیا، جنھوں نے حضرت یونس سے اپنے رویہ پر معذرت تک نہ کی تھی۔ کیونکہ اللہ نے دعوتِ حق دینے والے کو صبر و تحمل کی ذمہ داری دی ہے (سورہ یونس: 98,99۔ الانبیا: 88 ,87۔ الصافات: از 140 تا 146۔ القلم: 48,49,50)

خود محمد ﷺ نے نبوت اور ہدایت کے سلسلے میں نہ تو اللہ سے طاقت کے استعمال کی دعا کی نہ ہی مملکت کے سربراہ کی حیثیت سے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔ جن لوگوں پر فوج کشی کی گئی وہ مملکت کے معاہدوں اور معاملات کے سلسلے میں تھی نہ کہ دین اختیار کرنے یا چھوڑنے کے سلسلہ میں۔ حضرت عیسیٰ کو شدید پریشانیوں اور اذیتوں کا سامنا رہا۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی اذیتوں اور سختیوں سے گزرنا پڑا لیکن دونوں صورتوں میں اصول ایک ہی رہا یعنی لوگ نبی کا ساتھ دیں گے تو اسے حکمرانی کا حق ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ کو مدینہ کے لوگوں نے حکمرانی کا حق دیا تو وہ تب حکمران ہوئے۔ حضرت یسوع مسیح کو یہ حمایت حاصل نہ ہو سکی تو وہ

حکومت وقت کے ہاتھوں مصلوب ہوئے۔ اگرچہ اسلامی عقائد کی رو سے اللہ نے انہیں صلیب سے بچالیا، مگر انھیں حکمران نہیں بنایا۔ پھر جب ایک قوم نے ان کا دین اپنا لیا تو عیسائیت کی حکمرانی قائم ہوئی۔

تاریخ انبیا کی طرح ہر مفکر اور راہنما کو بھی لوگوں کی رائے ہموار کر کے ہی اقتدار اور اختیار حاصل ہوا اور عوامی رائے کے پلٹ جانے سے وہ بے اختیار ہوا۔ پھر اس استدلال کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے کہ چونکہ اسلام اللہ کا پیغام ہے، لہذا اسے تسلیم کروانے اور دنیا میں غالب کرنے کے لئے ڈنڈا اور تلوار استعمال کیے جائیں؟

کیا مذہب اور دین الگ ہیں؟

سیکولرازم کی بحث میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب کو روحانی اور ذاتی معاملات تک محدود کر کے دنیاوی معاملات کو دنیاوی طریقہ سے حل کیا جائے تو علما یہ دلیل دیتے ہیں کہ اسلام دیگر مذاہب سے اس طرح ممتاز ہے کہ یہ ایک دین ہے جو کہ روحانی اور مادی دونوں طرح کے معاملات پر مکمل تنظیم معاشرت کرتا ہے، جبکہ اس سے پہلے کے مذاہب کا معاملہ دوسرا ہے کیونکہ وہ مکمل ضابطہ حیات نہ تھے۔

اس طرزِ استدلال کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں۔ قرآن میں تمام مذاہب کو اور مذہبی عقائد کو دین کا نام دیا گیا ہے نہ کہ مذہب کا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل آیات دیکھیں۔

1. لکم دینکم ولی دین — تمھارے لئے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین۔ (یہ مشرکین مکہ کو کہا گیا) 109:6

2. و وَصّٰی بھا ابراھیم بنیہ و یعقوب ط یٰبنی ان اللہ اصطفٰی لکم الدین فلک تموتُن اللہ و انتم مسلمونo 2:132 — اور اسی کی وصیت ابراہیم اور یعقوب نے اپنے اپنے بیٹوں کو کی کہ اے بیٹو، اللہ نے تمھارے لئے یہ دین منتخب کیا ہے۔ سو مسلمان ہی مرنا۔

3.شرع لکم من الدین ما وصّٰی به نوحاً و الذی اوحینا الیک وما وصینابه ابرهیم و موسیٰ و عیسیٰ ان اقیم الدین ولا تتفرقو فیه کبرَ عَلَی المشرکین ما تدعو هم الیه ط

13: 42

اللہ نے تمھارے لئے وہ دین جاری کیا ہے جس کی اس نے نوح کو وصیت کی تھی اور جس کی ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کی ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو وصیت کی تھی کہ دین کو قائم رکھو۔ اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ مشرکین کو وہ دین ناگوار ہے جس کی طرف تو انہیں بلاتا ہے۔

4.هوالذی ارسل رَسوله بالهدیٰ و دین الحقِ لیظهره علی الدین کله وَ لو کره المشرکون o

61:9

وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اس دین کو تمام دینوں پر نمایاں کرے اگرچہ مشرکوں کو برا لگے۔

ان آیات میں دین سے مراد ہر وہ نظامِ تصورات ہے جس کی بنیاد معبود پر ہو، چنانچہ مشرکین مکہ کے عقائد کو اس لئے دین کہا گیا کیونکہ وہ بھی اپنے معبود کو مان کر اپنے عقائد ان سے منسوب کرتے تھے۔ کوئی بھی مذہب یعنی دین صرف عبادت تک محدود نہیں۔ قدیم و جدید ہندوستان کے بت پرستوں کا مذہب بھی صرف عبادات کا ایک طریقہ کار نہیں بلکہ اس میں فلسفہ ہے، فنونِ لطیفہ کا نظام ہے، شادی بیاہ بیماری موت تجہیز و تکفین، علاج معالجہ، جنسی زندگی، یوگ ورزش، حرام حلال کے ضابطے، سزا جزا اور آخرت کے تصورات۔۔ سب کچھ ہے۔ ایسے ہی عیسائیت نے معاشرتی تنظیم کے لئے مفصل نظام دیا ہے جس کی وجہ سے جدید سائنس کے ساتھ ہر مسئلہ پر اس کا ٹکراؤ ہوا۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ عیسائیت یا ہندومت صرف مذہبی عقائد تک محدود ہیں اور صرف اسلام ہی ہے جو عقائد سے آگے جا کر معاشرت کے دوسرے موضوعات پر راہنمائی کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر مذہب دین کی حیثیت سے

ہی اپنے پیروکاروں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

آج کے انسانی معاشرے کثیر المذاہب معاشرے ہیں اور یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ کسی ایک مذہب کو دوسرے پر جبراً مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ جن معاشروں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے وہاں بھی کسی نہ کسی مذہب کے ماننے والوں کی اکثریت ہے، جیسے مسلم معاشروں میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ مثلاً امریکہ میں عیسائی بھاری اکثریت میں ہیں۔ اسی طرح فرانس، انگلینڈ، جرمنی، سپین، اٹلی، روس، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کینیڈا میں ہیں۔ بھارت میں ہندو بھاری اکثریت میں ہیں، جیسے مشرقِ بعید اور جاپان میں بدھ مت کے پیروکاروں کی اکثریت ہے۔ لیکن ان سب ممالک میں مذہب کو بنیاد بنانے کی بجائے انسانی رائے اور باہمی مشاورت کو دنیاوی معاملات کی بنیاد مانا گیا ہے۔ جبکہ سبھی کو اپنے اپنے مذہب کی آزادی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ کسی مذہب کو دوسرے پر فائق نہیں کیا گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ خود مسلمان اکثریت کے کئی ممالک مثلاً ترکی، شام، عراق اور عرب امارات میں کسی مذہب کو مملکت کی بنیاد نہیں مانا گیا۔ غرضیکہ پاکستان، ایران اور سعودی عرب کے علاوہ شائد کوئی بھی قابلِ ذکر ملک آج کی دنیا میں ایسا نہیں جہاں مذہب کو ریاست کی بنیاد مانا گیا ہو، حتیٰ کہ اسرائیل بھی نہیں!

مسلم تاریخ کے انسانی فیصلے

غور سے دیکھا جائے تو اسلام کی تاریخ میں بھی صرف ایک عہد مکمل دینی حکومت کا ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا زمانہ۔ مکمل دینی سے مراد یہ ہے کہ اس ریاست کے سربراہ کو براہ راست ہر مسئلے پر اللہ کی راہنمائی حاصل ہوتی تھی یعنی وحی کا متحرک اور جاری و ساری نظام اس ریاست کی بنیاد تھا۔ تصدیق شدہ تاریخ کے جتنے ادوار ہیں ان میں واحد یہ دور ہے جس میں نبیؐ نے زندگی کے معاشرتی، سیاسی، معاشی، ازدواجی اور عسکری معاملات میں بطور سربراہ مملکت اور بطور نبی راہنمائی کی۔

دوسرے انبیا نے کسی مملکت کی تشکیل نہیں کی یا یوں کہہ لیں کہ ایسی مملکتوں کا کوئی تصدیق شدہ تاریخی ریکارڈ موجود نہیں۔ لہٰذا ان کا تذکرہ صرف اصول ہدایت کے بیان تک محدود رہتا ہے۔ چونکہ محمد مصطفےٰ ﷺ نے عملاً ایک ریاست کو وحی کے تحت چلایا۔ (مفصل بحث کے لئے دیکھیں اسلامی سلطنت کا مغالطہ)۔ لہٰذا آپ کے اس ممتاز رول سے مسلم علماء نے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ اسلام کا نظام ہدایت دوسرے ادیان کے مقابلے میں منفرد ضابطہ حیات ہے۔ جبکہ دوسرے ادیان محدود مقاصد کے لئے آئے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے جیسا کہ آیت نمبر 13:42 میں ہے کہ سبھی ابراہیمی ادیان نظامِ حیات کی حیثیت سے آئے۔

اسی نتیجہ سے مزید یہ اخذ کیا گیا کہ معاشرے کے تمام امور میں کسی ایسے شخص کو حاکم اعلیٰ رہنا چاہیے جو دین کی نمائندگی کرتا ہو اور یہ کہ ایسے شخص کی حیثیت رسول اللہ ﷺ کے جانشین کی ہوگی۔ حالانکہ رسول کا جانشین رسول ہی ہوسکتا ہے جیسے خود رسول اللہ ﷺ کے لئے قرآن نے یہ تصور بار بار دیا کہ وہ حضرت ابراہیم کے جانشین ہیں۔ رسول کا جانشین کوئی دوسرا اس لئے نہیں ہوسکتا کیونکہ رسول کا امتیاز وہ وحی ہے جس کو پہنچانے کے لئے رسول کو بھیجا گیا۔ غالباً اسی وجہ سے حضرت عمرؓ نے خلیفہِ رسول کی بجائے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔

رسول کے جانشین کا یہ نظریہ جو ہمارے علمائے دین کے ہاں پیدا ہوگیا یہی نظریہ مسیحیت اور ہندومت میں بھی کچھ فرق کے ساتھ موجود تھا، یعنی مذہبی راہنما کا مملکت میں کردار۔

خلافت راشدہ کے قیام سے اس نظریہ کو اور تقویت اور تصدیق ملی۔ مگر بعد کی تاریخ کے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ خلافت راشدہ کوئی مستقل قاعدہ و قانون ریاست نہ تھی۔ چنانچہ اس کی بنیاد اسلامی احکام میں تلاش نہیں کی جاسکتی۔ یہی سبب ہے کہ قرآن اور حدیث میں نبی کی سیاسی وراثت و نیابت کا کوئی اصول بیان نہیں کیا گیا۔ آپ ﷺ کی جس حدیث میں خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا ذکر آیا ہے اس کے مطابق بادشاہت کا ذِکر بھی آیا ہے۔ یعنی

کسی مستقل سیاسی تنظیم کا نہ وعدہ ہے نہ حکم۔ (مسند احمد، نعمان بن بشیر جلد ۴، ص ۲۷۳)

دینی ریاست کے حق میں ایک نظریہ یہ ہے کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے دین کے سربراہ کی حیثیت سے ریاست کی سربراہی کی، لہذا سنت پر عمل کا تقاضا یہی ہے کہ مملکت کو دینی سربراہ کی حیثیت سے چلایا جائے۔ اس خیال کو خلافت راشدہ کی مثال سے صحیح ثابت کیا جا سکتا تھا اگر یہ نظام مستقل طور پر چلتا، جیسے ارکان اسلام مستقل طور پر قائم ہیں۔ مثلاً نماز روزہ کی جگہ عبادت کا کوئی دوسرا نظام نہ کبھی رائج ہوا نہ اس کی گنجائش تھی لیکن خلافتِ راشدہ کی جگہ موروثی بادشاہت رائج ہوئی تو صدیوں تک مذہبی علما اور فقہا نے اسے قبول کیا، جس کا واضح معنی یہ ہے کہ یہ مستقل نظام نہ تھا۔ کیونکہ ریاست کی سربراہی رسول اللہ ﷺ کا وہ اسوہ ہے جو بطور رسول ہے۔ اور جیسے رسول کی رسالت ایسی سنت ہے جو قابل تقلید نہیں ایسے ہی ریاست کی سربراہی کا وہ عمل جو رسول اللہ نے سر انجام دیا وہ بطور سنت مسلمانوں کے سربراہوں کا استحقاق نہیں۔ یعنی ان کا مقام کبھی بھی رسول کے جانشین کا نہیں ہوسکتا۔ اسوہ کے اور بھی پہلو ایسے ہیں جو کہ وحی کی طرح صرف نبی کی ذات تک جائز ہوتے ہیں اور امتیوں کے لئے قابل تقلید نہیں۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد کسی حکومت کو وحی کی راہنمائی حاصل نہ تھی، لہذا مسلمانوں کی حکومتوں کی حیثیت عملاً دوسرے انبیا کے پیروکاروں کی حکومتوں جیسی ہی ہو گئی۔ نبی کی نائب حکومت کی مثال حقیقی تاریخ میں صرف خلافت راشدہ کی بتائی جاتی ہے۔ اگر مسلم اکثریت کے نکتہ نظر سے خلفائے راشدین نبی کے جانشین تھے تب بھی یہ نظام مختصر عرصہ تک قائم رہا۔ پھر نیابتِ رسول کا سلسلہ ختم ہو گیا اور بادشاہت کا نظام قائم ہوا۔ اور یہ نظام نہ دینی تھا نہ ہی دین کا مخالف۔ اسے ہم آج کی زبان میں سیکولر کہتے ہیں۔ اور اپنے دینی علما سے گزارش کرتے ہیں کہ اس کا مفہوم صرف اسی طرح سمجھنے کی کوشش کریں، یعنی دنیاوی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا کوئی شخص یا گروہ نبوت کے مقام کا وارث ہے؟ یعنی خلفا راشدین اور ان کے بعد کے زمانے میں کسی شخصیت یا ادارہ کو نبوت کا تسلسل کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ بہت ذمہ داری کا مسئلہ ہے۔ ایسا دعوی کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ نبوت کے اختتام کے بعد بھی الہام ووحی کا سلسلہ جاری ہے، یا کچھ لوگ اختیار اور مرتبہ کے اعتبار سے رسول کے برابر ہیں جو کہ دینی عقائد اور معقولیت دونوں اعتبار سے غلط ہے۔ یقیناً متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ الہام و وحی کا سلسلہ جاری نہیں لہذا کسی شخص یا ادارے کو نبوت کا تسلسل نہیں کہا جا سکتا، نہ ہی اسے رسول کی حکومت کا تسلسل قرار دے سکتے ہیں۔ غالباً یہی وہ نکتہ ہے جو اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ قرآن وحدیث نے رسول اللہ کے بعد کسی ایسے ضابطہ کا ذکر نہیں کیا جس سے سربراہ مملکت کا تقرر ہوسکتا کیونکہ ایسے ضابطہ سے مقرر ہونے والے سربراہِ مملکت کے بارے میں شائد لوگ اس عقیدے پر قائم ہو جاتے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا وارث و نائب ہے جسے رسول کی طرح کے اختیارات حاصل ہیں۔

یہ نتیجہ ہمیں اس بات تک لے آتا ہے کہ اگر ہم موجودہ زمانہ میں نائب رسول کی عدم موجودگی میں دینی بنیادوں پر کوئی نظام حکومت چلانا چاہتے ہیں تو پھر ہمارے سامنے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے، گرچہ اس راستے پر چل کر بھی قائم ہونے والی حکومت رسول اللہ ﷺ کی ریاست کا تسلسل نہیں ہوگی، بلکہ صرف اس سے مشابہ ہوگی۔ وہ راستہ مندرجہ ذیل ہے۔

زندگی اور دنیا کے حالات، بین الاقوامی تعلقات، معیشت، افکار، مادی وسائل، رہن سہن، آبادی کی تعداد وترتیب غرضیکہ ہر چیز کو اسی سطح اور حالت میں واپس لے آئیں جہاں وہ رسول اللہ ﷺ کے وقت میں تھی۔ ایسا ہونے سے یہ ممکن ہو جائے گا کہ جو جو فیصلے اور اصول رسول اللہ ﷺ کے دور میں متعین ہوئے وہ بغیر کم وکاست، بغیر ترمیم کے ہو بہو نافذ ہوسکیں گے۔ یہ صرف خیال کی بات نہیں۔ ایسی صورت حال پیدا کرنے کی کوششیں کی جا چکی ہیں کہ جدید زمانے کی ہر صورت حال اور مادی سامان کو مسلمانوں نے اپنی بود وباش سے

خارج کرنے کی تحریکیں چلائیں۔ مثلاً اخوان المسلمون اور طالبان نے۔ تاہم ایک الجھن پھر بھی درپیش ہوگی یعنی سربراہ کی حیثیت کا تعین۔ بہرحال اگر قرآن کے اس حکم سے راہنمائی لے لیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی اور اپنے حکمران کی اطاعت کرو تو حکمران کا رول اور کام متعین ہو سکے گا یعنی اس کا کام ہوگا معاشرہ کو اسی حالت میں رکھنا جس میں رسول اللہ ﷺ کے وقت میں تھا۔ اور وہی اصول اور فیصلے نافذ رکھنا جو رسالت کے ذریعے نافذ ہوئے تھے۔

صرف یہ واحد صورت ہے جس میں نظامِ حیات کافی حد تک دینی ہوگا۔ لیکن یہ ایک مہمل اور محض تصوراتی امکان ہے۔ کیونکہ اگر حالات بدل جائیں، معاشرہ بدل جائے، نئی معاشرتی فکری، بین الاقوامی حقیقتیں ابھر کر ہمارے قابو سے نکل جائیں جیسا کہ ہوا ہے، اور ہمیں ان کے لئے نئے اصول اور قوانین تیار کرنے پڑیں تو ان کا مقام انسانی فیصلوں کا ہی ہو گا نہ کہ دینی فیصلوں کا۔ کیونکہ جب انسان کسی دینی ضابطے کی تشریح کرتا ہے تو وہ انسانی تشریح ہوتی ہے۔ یعنی اجتہاد یعنی انسانی رائے۔ اور دینی فیصلہ صرف وحی کا فیصلہ ہی ہو سکتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اجتہاد کیا ہے۔ اور اجتہاد کا دائرہ کار کیا ہے۔ قرآن میں یعنی وحی میں اجتہاد کا کوئی لفظ موجود نہیں۔ سورہ نساء کی جس آیت سے بعض علما نے اجتہاد کا معنیٰ لیا ہے کہ" اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اپنے حکمران کی اطاعت کرو اور اگر تم میں کسی مسئلے پر تنازعہ ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ"۔ 4:59۔ جس سے یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ تنازعہ والی بات کا حل قرآن وسنت کی روح کے مطابق اپنی رائے سے تلاش کیا جائے۔ لیکن یہ مفہوم اس آیت میں اس طرح واضح نہیں جیسے یہ علما اخذ کرتے ہیں کیونکہ اس میں لوگوں کی اپنی رائے کا کوئی اشارہ موجود نہیں۔ چنانچہ اسے اجتہاد کے حق میں بیان کرنا کچھ ذاتی سی تشریح دکھائی دیتی ہے۔۔

اجتہاد کا ذکر صرف ایک حدیث کے ایک لفظ میں آیا ہے وہ بھی حضور ﷺ کے الفاظ نہیں بلکہ حضرت معاذؓ بن جبل کے ہیں کہ جب حضورؐ نے ان سے پوچھا کہ فیصلے کس بنیاد

پر کرو گے تو انہوں نے جواب دیا کہ قرآن وسنت کی روشنی میں کروں گا تو آپؐ نے پوچھا کہ اگر قرآن وسنت میں تمھیں اس کے لئے کوئی واضح ہدایت نہ ملے تو پھر؟ تو انہوں نے کہا کہ ''اجتہدُ من رائی'' یعنی اپنی رائے سے فیصلہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ اجتہاد کے معنی کسی شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کرنے کے ہیں اور کہیں بھی ایسا کوئی حکم موجود نہیں کہ اپنی رائے کا استعمال کرنے والا شخص دین کا مکمل عالم ہونا چاہیے۔ صرف اتنا ضروری ہے کہ اس کا فیصلہ کسی واضح دینی حکم کی نفی نہ کرتا ہو۔ اجتہاد کا تصور دراصل خلفائے راشدین کے عملی نمونہ سے جاری ہوا اور چونکہ خلفائے راشدین محترم صحابہ کرام تھے لہذا یہ نظریہ جڑ پکڑ گیا کہ شائد اپنی رائے سے فیصلہ کرنے کا حق صرف خاص درجہ کے بزرگوں کو حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حق کسی مذہبی اجارہ داری کے معنوں میں ہرگز نہیں۔ خلفائے راشدین نے بیسیوں معاملات پر فیصلے صادر کئے لیکن چند شرعی معاملات کے سوا مملکت کے عام امور میں قرآن وحدیث کے حوالے دینے کا رواج نہ تھا۔

مثال کے طور پر افواج کہاں بھیجی جائیں، ان کی کمان کس کے ہاتھ ہو، تعداد کیا ہو، فوج اور دوسرے اہلکاوں کی تنخواہیں ہوں تو کتنی۔ بیت المال سے وظائف کس کو اور کتنے۔ شہروں کے عمال اور قاضی کے تقرر کی میعاد۔ خود خلیفہ کی میعاد خلافت۔ خود خلفا کے تقرر کا طریقہ۔ اہلکاروں کے اختیارات کا تعین۔ نومسلموں اور اقلیتوں کے بارے میں انتظام۔ عالمی تعلقات۔ عالمی تجارت کے انتظامات۔ نئے شہروں کے اصول شہریت۔ ان فیصلوں میں کبھی آئتوں اور حدیثوں کا حوالہ نہیں دیا جاتا تھا مثلاً حضرت عمرؓ نے جب حضرت خالد بن ولید کو معزول فرمایا تو کسی دینی حوالہ کا ذکر نہیں کیا اور یہ بھی درست نہیں کہ خلفائے راشدین کو سارا قرآن اور ساری حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ کیونکہ خلفائے راشدین میں سے کوئی بھی حافظِ قرآن نہ تھا۔ اور احادیث تو جمع ہی ان کے بعد ہوئیں۔

خلیفہ اوّلؓ کے اقتدار سنبھالنے کے واقعہ سے بھی اس سلسلے میں واضح روشنی ملتی

ہے۔ اس واقعہ سے تین دن پہلے یعنی رسول اللہ ﷺ کے وصال سے تین روز قبل جب آپؐ نے کاغذ قلم مانگا اور وصیت لکھوانے کی خواہش ظاہر کی تو وہاں موجود صحابہ کی بحث اور تکرار کے باعث آپؐ کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی (صحیح بخاری شریف" جلد 1 صفحہ 25)۔ اہلِ تشیع کے مطابق یہ وصیت رسول اللہ ﷺ کے بعد سربراہی کے سوال پر تھی۔ اس نظریہ کی صحت سے قطع نظر یہ بات واضح ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کی وصیت سے کوئی شخص نائب رسول مقرر ہو جاتا تو اسے دینی سربراہ کا درجہ حاصل ہو جاتا۔ لیکن اس نامزدگی کے رک جانے سے نیابت رسولؐ یعنی دینی سربراہی کی جگہ دنیاوی سربراہی کا اصول رائج ہوا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اقتدار اگرچہ ایک نہایت محترم شخصیت کا اقتدار ہے پھر بھی یہ دنیاوی اصولوں پر قائم ہوا۔ اپنے سفرِ آخرت سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کی نامزدگی کا پروانہ وصیت لکھوایا تو حضرت عمرؓ نے اسے درست تسلیم کیا اور یہ اعتراض نہیں فرمایا کہ قرآن کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی وصیت کی ضرورت نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی اس وصیت سے بعض صحابہ رسول کا اختلاف بھی کسی شرعی بنیاد پر نہ تھا (تاریخ طبری جلد 2 صفحہ 621)۔ آپؓ نے اس اختلاف کو اہمیت نہیں دی نہ ہی حضرت عمرؓ نے، کیونکہ یہ دنیاوی فیصلے تھے اور ان میں اکابرین کرام کا اختلاف دینی مسئلہ نہ تھا۔ اہم ترین مثال خود قلم قرطاس والے واقعہ کی ہے۔ جب رسول اللہؐ نے وصیت کے لیے کاغذ قلم مانگا اور صحابہ میں سے کسی نے یہ کہا کہ "حسبنا القرآن" یعنی "ہمارے لئے قرآن کافی ہے" تو حضرت عمرؓ موجود تھے۔ کسی نے یہ نہیں کہا رسول اللہؐ کے حکم کو نہ ماننا گستاخی رسالت ہے۔ حالانکہ کچھ اور نامناسب لفظ بھی حدیثوں میں بیان ہوئے ہیں۔ کسی نے یہ بھی نہیں کہا کہ نبی علیہ السلام کے ان الفاظ کی حیثیت دینی ہے۔ بلکہ صحابہ کے طرزِ عمل سے یوں لگتا ہے کہ آپؐ کی یہ خواہش بطور نبی نہ تھی لیکن اگر صحابہ کرام نے یہ طے کیا کہ آپؐ کی یہ خواہش صرف بشری خواہش ہے اور اس کی حیثیت فرمان نبوی کی نہیں تو صحابہ کا یہ فیصلہ کسی آیت یا حدیث کی روشنی میں نہیں بلکہ عقلی اور دنیاوی فیصلہ تھا۔ اگر کہا جائے کہ ایسے دنیاوی فیصلے کرنے

کا حق صرف صحابہ کو تھا تو یہ کہنا بھی دنیاوی رائے ہوگی کیونکہ ایسا قرآن یا حدیث نے نہیں کہا۔

ثقیفہ بنوسعدہ میں مہاجر وانصار کی فضیلت کی بحث یا قریشی غیر قریشی کے استحقاق کی بحث، کسی آیت، شرعی حکم یا حدیث کا ذکر کئے بغیر ہوئی۔ یعنی ایک سادہ دنیاوی انداز میں۔ اور حضرت سعد بن عبادہؓ یا دوسرے انصاری صحابہ کا اختلاف بھی کسی شرعی بحث کی صورت میں نہ تھا۔ لہٰذا واضح طور پر اجتہاد کی وہ شکل ہے جسے ہم بشری یا دنیاوی طرز فکر کہتے ہیں۔ کیونکہ اس اختلاف انگیز مسئلہ پر قرآن وسنت میں کوئی راہنمائی موجود نہ تھی۔ اگر ایسی رہنمائی موجود ہوتی تو بحث کیوں ہوتی اور ایسی رہنمائی کا ذکر کیوں نہ ہوتا؟ خلافت کے لئے بیعت کا عمل بھی ایک انسانی یعنی دنیاوی انداز سے ہوا۔ نبی ﷺ کو تو مدینہ کے لوگوں نے بلا کر اپنا سربراہ بنایا تھا، خلیفہ اوّلؓ نے لوگوں کو بلا کر بیعت لی، جس میں لوگوں کی پیش کش نہیں بلکہ رضامندی شامل تھی۔ کیونکہ نبوت ودیعت ہے جبکہ خلافت اکتساب۔ ظاہر ہے نہ یہ دینی معاملہ تھا نہ اس کے لئے کسی دینی حکم سے فیصلہ لیا گیا۔ یہ صحابہ کرام کا انسانی فیصلہ تھا۔

قرآن کا حکم صرف اتنا تھا کہ اللہ، اور اس کے رسول اور اپنے میں سے بننے والے حکمران کی اطاعت کرو۔ ایک غلط فہمی یہ ہے کہ چونکہ قرآن وحدیث نے تقویٰ یا علم کو فضیلت دی ہے، لہٰذا دنیا کے معاملات میں بھی ان خوبیوں کو فضیلت حاصل ہے۔ کاش ایسا ہوتا لیکن عملاً ایسا نہیں۔ خصوصاً جب قرآن یا حدیث نے سربراہ کے تقرر کا سوال ہی نہیں اٹھایا تو سربراہی کے لیے معیار کا تعین بھی نہیں کیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ علم وتقویٰ کی فضیلت سے مراد اللہ کے ہاں درجات کی فضیلت ہے۔ دنیا کے امور کے لئے اگر اللہ نے اسے فضیلت بنایا ہوتا تو پھر مال و دولت، اولاد، اقتدار، میدان جنگ یعنی ہر کام میں متقی اور عالم کو دوسروں سے افضل کر دیتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ متقی تو حضرت علیؓ بھی تھے، حضرت ابوعبیدہؓ بھی تھے، جن کو بقول حضرت عمرؓ رسول

اللہ ﷺ نے امین امت کہا تھا (طبری جلد 3 ص 192)۔ اور حضرت ابو ذر غفاریؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، خود سعد بن عبادہؓ اور دوسرے صحابہ رسول بھی متقی تھے جنھیں اقتدار سے رغبت تھی نہ دولت سے۔ علم میں حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ اور خود حضرت عمرؓ کا مقام مسلمہ تھا۔ لہٰذا غالباً تقوی اور علم سربراہ مملکت کے تقرر کی بنیاد نہ تھے بلکہ دنیاوی معاملات کی سوجھ بوجھ اور دانشمندی کے ساتھ ساتھ تجربہ اور بااثر لوگوں کی حمایت اس کی بنیاد تھی۔

حضرت عمرؓ نے تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے لئے چھ افراد کا چناؤ کیا۔ یہ بھی کسی شرعی حکم کی تعمیل نہ تھی، بلکہ دنیاوی عقل کا فیصلہ تھا۔ آپؓ نے چھ افراد کے اس پینل پر کمرے میں بند کرنے اور تین دن میں فیصلہ کرنے کی پابندی عائد کی (طبری جلد 3 ص 292)۔ یہ فیصلے اجتہادی تھے اور ان میں قرآن وسنت کے کسی حکم کا حوالہ دیا گیا نہ کسی عالم دین سے فتویٰ پوچھا گیا۔ یہ شاندار انتظامی فیصلے جو مملکت کے مفاد میں کئے گئے، نہ تو کسی شرعی حکم کے خلاف تھے نہ مطابق، بلکہ ایک بلند پایہ راہنما کی دانش کا مظہر تھے۔ فیصلوں کی بنیاد نبوت میں تو وحی پر تھی لیکن وحی کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد ایسے فیصلے جن میں کسی اصول دین کا تذکرہ نہ کیا جائے، دنیاوی ہی کہے جاسکتے ہیں۔

امور مملکت کے کئی فیصلے خلفائے راشدین نے دنیاوی عقل کی روشنی میں کئے۔ مثلاً وفات سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے جانشین کے طور پر حضرت عمرؓ کو نامزد کیا۔ یہ بھی انسانی فیصلہ تھا۔ پھر حضرت عمرؓ نے ایک الگ طریقہ انتخاب استعمال کیا جس سے حضرت عثمانؓ امیر المومنین بنے، یہ بھی انسانی فیصلہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے خلیفۂ رسول کا لقب تبدیل کر کے اپنے لئے امیر المومنین کا لفظ چنا۔ اپنے لئے حضرت ابوبکرؓ سے مختلف نام چننے کا یہ فیصلہ بھی اطاعت کی بجائے صوابدید کا اظہار تھا۔ حضرت عمرؓ کے دور حکومت کے کتنے ہی فیصلے ایک صائب الرائے امیر کے وہ فیصلے تھے جن میں شرعی معاملات کے علاوہ آپ نے بیشتر مسائل پر

مشاورت کا اصول اپنایا یعنی عقل و استدلال کے ذریعے حل کرنے کا طریقہ، جبکہ رسول اللہ ﷺ وحی سے فیصلے کرتے تھے نہ کہ مشاورت سے۔ حضرت علیؓ سے لی جانے والی آرا بھی حضرت عمر نے ان کی ذہانت اور ان کے علم کی وجہ سے قبول کیں نہ کہ امام کی حیثیت سے۔ کیونکہ اگر حضرت عمرؓ انہیں امام مانتے تو پھر امام کے ہوتے ہوئے انہیں حکمران ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ شرعی معاملات میں بھی کچھ فیصلے ایسے ہیں جن میں حضرت عمر فاروقؓ نے صوابدید کا استعمال کیا۔ مثلاً اپنے فرزند ابو شحامہ کو دوبارہ کوڑے مارنے اور قید کرنے کا فیصلہ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر زنا کے الزام کی تحقیقات کرتے وقت گواہوں پر جرح کا طریقہ اختیار کرنا جبکہ قرآن میں یا رسول اللہ ﷺ کی سنت میں گواہوں سے صرف زنا کی گواہی پوچھی جاتی تھی نہ کہ اس کی تفصیلات۔ اور حضرت عثمانؓ کے چناؤ کے لئے نامزدگی کی بجائے پینل کا قیام۔ حضرت عمرؓ کے ان فیصلوں کے عمدہ نتائج کے باوجود یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ یہ فیصلے آپؓ کی عقل سلیم کے فیصلے تھے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سب فیصلے جو اگرچہ نہایت محترم صحابہ کے فیصلے ہیں، وحی یا الہامی فیصلوں کا درجہ نہیں رکھتے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے بہت سے انتظامی فیصلوں پر اس وقت موجود صحابہ اور بزرگوں نے اختلاف کیا اور اختلاف سنگین صورت اختیار کر گیا۔ لیکن امیر کی حیثیت سے حضرت عثمانؓ نے صوابدید کا بھرپور استعمال کیا، حالانکہ اختلاف کرنے والوں نے اپنے اعتراض کی حمایت میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کے حوالے بھی دیے، مثلاً مروان کے بارے میں۔ اسلامی ریاست کو نقصان پہنچنے کی دلیل بھی دی گئی، تاہم آپؓ نے اس تحریک کو فتنہ قرار دیا اور اس کا دباؤ قبول نہیں کیا۔ آپؓ نے سربراہی سے الگ ہونے کا مطالبہ بھی مسترد کر دیا اور شہادت منظور کی لیکن ان فیصلوں کے لئے کسی شرعی حکم کا ذکر نہیں کیا لہٰذا واضح ہے کہ یہ فیصلے عقلی تھے، صوابدیدی تھے نہ کہ تقلیدی۔ کیونکہ ایسی کسی صورت حال کا سامنا پہلے خلفا کو نہ تھا۔

حضرت علیؓ نے قاتلانِ عثمان کی گرفتاری اور حوالگی کے اصرار کا جو جواب حضرت

معاویہؓ کو دیا وہ انہوں نے قبول نہ کیا۔ یہ اختلاف دس ہزار مومنوں کی شہادت پر منتج ہوا۔ ان محترم بزرگوں کا یہ اختلاف کسی دینی اصول کی تشریح تھا یا نہیں، اس پر علما نے کبھی روشنی نہیں ڈالی۔ یہ دنیاوی معاملات تھے اور فیصلے بھی دنیاوی۔ اجتہاد کی صورت بھی یہاں دکھائی نہیں دیتی۔ کیونکہ فریقین کا اپنا اپنا موقف تھا، لہذا ظاہر بات یہی ہے کہ اگر اجتہاد کہا جائے تو پھر اجتہاد وہ تھا جو کامیاب ہوا، یعنی بادشاہت کا فیصلہ۔

ان محترم بزرگوں نے جو بھی فیصلے کئے ہم ان پر کسی رائے زنی کی مجال نہیں رکھتے کیونکہ ہمارے علما کا حکم ہے کہ ایسی رائے نہ دی جائے۔ حالانکہ ایسی رائے دینے سے قرآن و سنت نے کہیں منع نہیں کیا۔ چنانچہ صرف اتنا کہنا مناسب ہے کہ یہ فیصلے دینی فیصلے نہیں بلکہ عقل انسانی کے فیصلے ہیں جس سے مراد دین کے مخالف فیصلے نہیں۔ بار بار یہ وضاحت ضروری ہے کہ سیکولر سے مراد لادینی نہیں۔ سیکولرازم نہ دینی ہے نہ لادینی۔ بلکہ دنیاوی اور انسانی عقل پر مبنی فکر و عمل کو سیکولر کہا جاتا ہے۔

حضرت معاویہؓ نے اپنے فرزند کو حکمران بنا دیا۔ ان کا یہ فیصلہ بھی عقلی تھا۔ اسے امت کی اکثریت نے قبول کر لیا حالانکہ اس وقت صحابہ اور تابعین موجود تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے فیصلہ میں کوئی قباحت نہیں دیکھی گئی۔ اور اگر خلفائے راشدین نے سربراہ کے طریقہ تقرر کو کوئی قانونی حیثیت نہیں دی تو یہی مقصد تھا کہ وقت کے ساتھ جو تبدیلیاں ضروری ہوں، وہ کر لی جائیں۔ یعنی چونکہ یہ دنیاوی فیصلے تھے اس لئے اس وقت موجود بزرگوں نے ان فیصلوں کے لئے قرآن و سنت کے حوالے دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

خاندانِ رسول کا قتلِ عام بھی امت مسلمہ میں کسی فوری ہلچل یا کسی اسلامی تحریک کا باعث نہیں بنا، حالانکہ یہ دردناک واقعہ سن کر آج بھی ہر مسلمان کا دل دکھتا ہے، کیونکہ اس وقت کے مسلمانوں کی نظر میں یہ سب دنیاوی معاملات تھے۔ اور غالباً ان کے نزدیک یہ واقعات دین میں خلل کے مترادف نہیں تھے۔ واقعہ کربلا پر ردِ عمل اتنا فوری نہ تھا جتنا عبدالرشید

غازی اور جامعہ حفصہ کے مسلح بچے بچیوں کے قتل پر ہوا۔

بعد میں جب بنو عباسیہ نے خاندان رسول کے قتل کو جذباتی مسئلہ بنا کر حکومت حاصل کی تو تب دنیاوی معاملات کو دینی رنگ دینے کی وہ روایت شروع ہوئی جس سے مسلمانوں کی پہلی نسل واقف ہی نہ تھی۔ یہی وہ روایت ہے جس کے باعث دنیاوی معاملات کو دینی معاملات سے گڈمڈ کر دیا جاتا ہے۔ اور تحریک پاکستان کو تحریک اسلامی کا درجہ دے کر اور پاکستان جیسے کثر دنیادار ملک کو اسلام کا قلعہ قرار دے کر اسلامی جمہوریہ پاکستان بنا دیا جاتا ہے تاکہ ایک مخصوص طبقے کی قیادت قائم رہے۔

جب قائداعظم نے یہ کہا کہ پاکستان کے سب لوگ پہلے پاکستانی اور پھر کچھ اور ہیں یا یہ کہا کہ آپ سب کو اپنی اپنی عبادت گاہوں میں جانے کی آزادی ہے تو ان کے سامنے سیکولر حقائق پر مبنی ایک ایسا ملک تھا جس میں اکثریت گرچہ مسلمانوں کی تھی لیکن کسی کا دین کسی کے دین پر فائق نہ تھا، یعنی معاشرہ نہ مولوی کا تھا نہ پادری کا نہ پنڈت کا۔ بلکہ جدید دنیا میں رہتے ہوئے ایک سیاسی نظام کے تحت چلنے والا ایک ملک جس میں مذہبی طور پر سب کے حقوق برابر ہوں۔

آج جب تاریخ کا طالب علم حضرات گرامی جناب علی مرتضیٰؓ اور جناب معاویہؓ کے درمیان یا جناب علی مرتضیٰؓ اور سیدہ عائشہ صدیقہؓ کے درمیان مسلح تصادم پر حیرت کا اظہار کرتا ہے یا خاندان رسول کے قتل پر اس وقت کے مسلم خواص وعوام کی بالعموم خاموشی پر ہم دکھی ہوتے ہیں تو اس بنیادی حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ کہ اسلام کی پہلی نسلوں کو ہر بات میں اسلام اور دینی جذباتیت شامل کرنے کی ابھی عادت نہیں پڑی تھی۔

اجتہاد کا حق

یہاں ہم سیکولرازم کی بحث کے سب سے اہم نکتہ پر پہنچتے ہیں۔ وحی اور نبوت سے تعمیر ہونے والا معاشرہ جب رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد اپنے فیصلے کرنے لگا تو یہ بحث

کہیں بھی اٹھائی نہیں گئی۔ کہ اجتہاد کا مفہوم کیا ہے۔ اس کی حدیں کیا ہیں اور اجتہاد کا حق کن لوگوں کو ہے۔ جن لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کی حکمرانی کو چیلنج کیا۔ ان کا اعتراض بنیادی طور پر وہی تھا جو ایک پسماندہ مفروضے پر مبنی ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ یعنی یہ تصور کہ نبیؐ کے بعد چونکہ نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا لہٰذا مرکزی قیادت بھی گئی۔ جس میں بنیادی غلط فہمی وہی ہے جو آج کے دینی ریاست کے حامیوں کے ہاں پائی جاتی ہے۔ غلط فہمی کی بنیاد اس سوال پر ہے کہ نبی ﷺ کی بنائی ہوئی امت کا سربراہ کیسے منتخب ہو؟ اور اگر اس کا فیصلہ اجتہاد کے ذریعہ ہونا طے ہو چکا ہے یعنی شوریٰ بینکم کی بنیاد پر، تو مشاورت کن کن کے درمیان ہوگی؟ اہلِ تشیع کے علاوہ سب کا عقیدہ ہے کہ کسی کو نامزد نہیں کیا گیا۔ قرآن و حدیث نے مملکت چلانے کے لیے نائب رسول کے تقرر کا کوئی طریقِ کار نہیں دیا۔ قرآن و حدیث نے اولی الامر کے لیے کہیں یہ شرط عاید نہیں کہ اس کا دینی مقام تسلیم شدہ ہو۔

حضرت ابوبکرؓ ثقیفہ بنوسعدہ کی بحث میں دینی علم کی فضیلت یا تقویٰ میں برتری کو استحقاق نہیں مانا گیا نہ ہی کسی نے ایسی کسی برتری کا دعویٰ کیا۔ بلکہ تحریک انقلاب میں خدمات وقربانیوں کا ذکر آیا۔ اگر یہ طے تھا کہ فیصلہ دینی یا علمی حیثیت کی بنا پر ہوگا۔ اور حضرت ابوبکرؓ کی دینی اور علمی فضیلت بھی تسلیم شدہ تھی تو پھر بحث نہ ہوتی کیونکہ اللہ اور رسول کے طے کئے ہوئے پر صحابہ رسول کیسے اختلاف کر سکتے تھے۔

لہٰذا یہ فیصلہ خالصتاً عقلی تھا، فیصلہ کرنے کا حق کس کو حاصل ہے، اس کا فیصلہ بھی عقلی تھا، اس فیصلہ پر عمل درآمد کا طریقِ کار بھی عقلی تھا، اہلِ مدینہ کی طرف سے تائید اور کئی قبائل کی طرف سے مخالفت کا فیصلہ بھی اپنی اپنی جگہ عقلی تھا، اور وہ فیصلہ صحیح تسلیم ہوا جو کامیاب ہوا، اور اسے فقہ کی حیثیت بہت بعد کے علما نے دی۔

بعد میں بھی دینی معاملات میں فیصلے علمی اور دینی برتری کے معیار پر نہیں ہوئے بلکہ دنیاوی تجربہ عقل وخرد، خاندانی ساکھ، قبائلی حمایت، غرض کہ مختلف اصولوں کی بنا پر ہوئے۔

مورخین کے مطابق حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو، حضرت علیؓ کی علمی اور دینی فضیلت کا اعتراف تھا اور سبھی صحابہ کو بھی اس کا اعتراف تھا، لیکن خلافت کے معاملہ میں آپؓ کی کم عمری یا تجربے کی کمی آڑے آئی، جو خالصتاً دنیاوی معیار تھا۔ پھر حضرت معاویہؓ دینی و علمی فضیلت میں تمام روایات کے مطابق حضرت علیؓ کے ہم پلہ نہ تھے۔ نہ یزید بن معاویہ کو دین میں امام حسنؓ و حسینؓ کا ہم پلہ قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی اہم ہے کہ یزید بن معاویہ حسنؓ و حسینؓ سے عمر اور تجربہ میں بھی کہیں کم تھے۔ (یعنی وہ معیار جن کی بنا پر کچھ عرصہ پہلے حضرت علیؓ کو پہلے خلفا سے کم سمجھا گیا تھا)۔ لیکن امتِ مسلمہ نے ان حکمرانوں کو اپنی سربراہی کے لئے قبول کیا اور انہوں نے نسل در نسل حکومت کی اور امت نے معاشرتی، دینی اور دنیاوی سب معاملات پر ان کا یہ استحقاق تسلیم کیا کہ وہ فیصلے کریں۔

اجتہاد کا یہ تصور جس میں ایک مخصوص طبقے سے تائید حاصل کئے بغیر کوئی فیصلہ اسلامی تسلیم نہیں کیا جاتا، دراصل اسلام کا تصور نہیں۔ اگر یہ تصور اسلامی ہے تو پھر ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پہلی صدی ہجری کے بزرگوں نے اس تصور کو اپنی دنیا میں نافذ نہیں کیا اور نہ اس کے لئے کوئی جدوجہد کی۔ اب یہ ہمارے موجودہ علما کا کام ہے کہ وہ یہ طے کریں کہ ان میں سے کون سی بات سچ ہے۔

تاریخ کے مطابق یہ تصور خلافتِ بنی عباسیہ کے دور میں عیسائی پادریوں کے اثرات کے تحت اسلامی معاشرے میں در آیا اور ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ یہ مطلق العنان بادشاہ اپنی بہت سی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے اس بات کے محتاج تھے کہ اس وقت کے سرکردہ مذہبی علما کی تائید حاصل کرنے کے لئے ان کی خوشامد کریں اور اس لئے یہ تصور عام ہو گیا کہ اجتہاد علما کا ایک خاص طبقہ ہی کر سکتا ہے حالانکہ عملاً سبھی فیصلے بادشاہ خود کرتا تھا۔ اسلام کی ابتدائی نسلوں میں صرف ایک پابندی حکمران پر لازم تصور کی جاتی تھی کہ وہ قرآن و سنت کے واضح احکام کی مخالفت نہ کرے۔ یعنی پانچ ارکان اور حدود اللہ میں دخل اندازی نہ کرے۔ ورنہ باقی تقریباً ہر

معاملے میں اسے اختیار تھا۔ چنانچہ جب خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے قیادت سنبھالی تو صرف یہ شرط عائد کی کہ اگر میں قرآن وسنت سے انحراف کروں تو میری اطاعت نہ کرو۔ یہ اعلان اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت اور حکمران کی اطاعت کے مشروط تصور پر مبنی تھا۔

چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے بطور اولی الامر جو پہلا بڑا اجتہادی فیصلہ کیا اس پر غور کرنے سے ہمارے استدلال کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ مدینہ میں قائم ہونے والی نئی حکومت سے بغاوت کرنے والوں کے بارے میں مولانا مودودی لکھتے ہیں:

''کچھ لوگ تمام ضروریاتِ دین کے قائل تھے اور زکوٰۃ بھی ادا کرنے کے لیے تیار تھے مگر ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم اپنی زکوٰۃ بطور خود جمع اور خرچ کریں گے، ابوبکر کے عاملوں کو نہیں دیں گے۔ کچھ اور لوگ کہتے تھے ''اطعنا رسول اللہ اذکان بیننا، فوا عجب ما بال ملک ابی بکر '' (ترجمہ: ہم نے خدا کے رسول کی پیروی کی جب وہ ہمارے درمیان تھے مگر مقامِ حیرت ہے کہ یہ ابوبکر بادشاہ کیسے بنے) گویا انہیں اعتراض اس بات پر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ کے بعد خلافت کا نظام قائم ہو اور انہیں اسی طرح مرکز سے وابستہ رہنے پر مجبور کیا جائے جس طرح وہ رسول اللہ کی شخصیت سے وابستہ تھے۔''

مولانا مرحوم نے حضرت ابوبکر کا وہ اعلان بھی نقل کیا ہے جو آپ نے ان لوگوں سمیت مرکز سے بغاوت کرنے والوں اور مرتد ہونے والوں کو مخاطب کر کے کیا جسے حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ جلد 6 کے صفحہ 316 پر لکھا ہے:

''تم میں سے جن لوگوں نے شیطان کی پیروی قبولی کی ہے اور جو اللہ سے بے خوف ہو کر اسلام سے کفر کی طرف پھر گئے ہیں اُن کی اس حرکت کا حال مجھے معلوم ہوا۔ اب میں نے فلاں شخص کو مہاجرین وانصار اور نیک نہاد تابعین کی ایک فوج کے ساتھ تمہاری طرف بھیجا ہے اور اسے ہدایت کر دی ہے کہ ایمان کے سوا کسی سے کچھ قبول نہ کرے اور اللہ عزوجل کی طرف دعوت دیے بغیر کسی کو قتل نہ کرے۔ پس جو کوئی اس کی دعوت الی اللہ کو قبول کرے گا

اور اقرار کرنے کے بعد اپنا عمل درست رکھے گا، اس کے اقرار کو وہ قبول کرے گا اور اسے راہِ راست پر چلنے میں مدد دے گا اور جو انکار کرے گا اس سے وہ لڑے گا یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ اس کو حکم دیا گیا ہے کہ انکار کرنے والوں میں سے جس پر وہ قابو پائے، اسے جیتا نہ چھوڑے ان کی بستیوں کو جلا دے، ان کو نیست و نابود کر دے، ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لے اور اسلام کے سوا کچھ قبول نہ کرے۔ پس جو اس کی بات مان لے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو نہ مانے گا وہ اللہ کو عاجز نہ کر سکے گا۔''

یہ حقیقت اہم ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ کی سربراہی نہ ماننے والے اور زکواۃ مرکز کو دینے سے انکار کرنے والے مسلمانوں کو مرتد قرار دے کر ان کے قتل کا حکم دیا گیا تو یہ ایک بہت بڑا اور اہم اجتہاد تھا لیکن مدینہ میں اس بات پر نہ کوئی ایجی ٹیشن ہوئی نہ کوئی خودکش حملے ہوئے، کہ آپؐ کلمہ گو مسلمانوں کو مذاکرت اور فری پیج (Free Passage) دینے کی بجائے ان کو قتل کرنے اور ان کے بچوں اور بچیوں کو غلام بنانے کا حکم کیوں دے رہے ہیں بلکہ مولانا مودودی کے بقول ''ان سب لوگوں کے لیے صحابہ نے باغی کی بجائے مرتد کا لفظ استعمال کیا۔'' یاد رہے کہ اس موقعہ پر کسی صحابی نے اس حدیث کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا، جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دفاع میں باغیوں کے سامنے پیش کیا، جسے مولانا مودودی نے مرتد کے لیے سزائے موت کی بنیاد بنایا ہے (کسی کلمہ گو کا قتل جائز نہیں بجز اس کے کہ اس نے قتل کیا ہو، شادی شدہ ہو کر زنا کیا ہو، یا اپنے دین سے پھر گیا ہو)۔ اس حدیث کی رو سے مرکز کو ادائیگی زکوٰۃ سے انکار کرنے والے ان تین صورتوں میں سے کسی کے بھی مرتکب نہیں تھے اور نہ ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے فیصلے کی تائید میں فقہ کے کسی ایسے اصول کی وضاحت فرمائی جس کی رو سے مرکز کو زکوٰۃ نہ دینا ارتداد کے برابر ہوتا ہو۔ لیکن آپ کے اس اجتہاد سے اسلامی سلطنت کا مستقبل محفوظ ہو گیا اور یہ اجتہاد آپؓ نے انسانی دانش کے استعمال سے کیا۔

سبھی جانتے ہیں کہ صدیوں تک مسلم معاشروں کے حکمران دنیاوی اصولوں پر حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ برصغیر ہند میں رضیہ سلطانہ نے حکومت کی اور ہمارے علم میں نہیں کہ اس وقت کے مسلم علما نے عورت کی حکمرانی کے خلاف کوئی فتویٰ یا مہم جاری کی ہو۔ جب کہ ہمارے ہاں شہید محترمہ بینظیر کے مسئلہ پر یہ ایک قاعدہ بن گیا تھا۔ رضیہ سلطانہ مسلمانوں کی بادشاہ تھی اور پھر شہزادہ سلیم نے حکومت کی جس کی شراب نوشی کے لئے علانیہ شملہ سے روز برف لائی جاتی تھی جس کا اس نے فخر سے تزکِ جہانگیری میں ذکر کیا ہے۔ اکبر نے واضح طور پر ہندو مسلم مساوات پر مبنی سیکولر مسلمان حکومت کا تصور دیا۔ اورنگ زیب نے اقتدار کے لئے باپ کو قید کیا، بھائیوں کو قتل کیا، لیکن مولویوں مفتیوں نے کمال اطاعت سے اس کی خدمت میں فتوے پیش کئے، جو اُس نے اپنے نام سے تاریخ کے سپرد کئے۔ مگر ان چیرہ دستوں کے خلاف، ان وقتوں میں موجود مسلم آئمہ اور رہنماؤں نے نہ تو کوئی دھرنے دئے نہ کسی جامعہ حفصہ نے تلوار توپ کا اہتمام کیا۔ واضح رہے کہ ہم کسی بادشاہ یا فوجی آمر کو جائز حکمران نہیں مانتے نہ ہی اس کے حق میں کوئی دلیل دے رہے ہیں۔ بلکہ ان فکری الجھنوں کا بیان مقصود ہے جو ہمارے وقتوں میں رائج ہوگئی ہیں، جن کا سبب شائد غفلت ہے۔

مسلمانوں کی ساری تاریخ سیکولر نظام معاشرت کی تاریخ ہے۔ نہ صرف دنیاوی بلکہ دینی مسائل پر بھی فیصلوں کا انداز پر اعتماد تھا۔ اور انگریز کے نوآبادیاتی دور تک علما کرام کا کوئی گروہی کردار مسلمانوں کی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں دکھائی نہیں دیتا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کئی صدیاں اسلام اور امت مسلمہ اندھیروں میں بھٹکتے رہے کیونکہ ان کی سماجی اور سیاسی زندگیوں میں موجودہ اسلامی جماعتوں کی طرز پر منظم جماعتیں موجود نہیں تھیں؟ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان صدیوں میں مسلم امہ کی نسلیں علم و فضل کے ایسے مقام پر تھیں کہ ہر مسئلے پر ان کا فکر پختہ اور واضح تھا اور ہر فیصلہ بغیر بحث کے خود بخود عین شرعی اصولوں پر ہو جاتا تھا؟ یہ دونوں باتیں حقائق کے خلاف ہیں نہ تو اندھیرے میں بھٹکنے کی بات سچ ہے نہ ہی یہ بات

مبالغہ سے خالی ہے کہ سارا مسلم معاشرہ علم کے اونچے معیار پر پہنچ چکا تھا۔ اس بات کا اندازہ ان اختلافات سے ہو جاتا ہے جو حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں، پھر جنگِ صفین، جنگِ جمل میں اور بعد ازاں کربلا کے واقعہ میں نظر آتے ہیں۔ یا اس زبردست خانہ جنگی سے واضح ہو جاتا ہے جس کے بعد خلافتِ بنی عباسیہ قائم ہوئی۔ یا پھر ان حالات سے علمی اور دینی معیار کا پتہ چلتا ہے جب مسلم علما بغداد کی گلیوں میں بے مقصد سوالات پر مناظرے کرتے تھے جب ہلاکو نے بغداد کو تاراج کیا۔ نہ ہی یہ صحیح ہے کہ ان کے علمی اور دینی معیار بہت پست تھے۔

سچ یہ ہے کہ نبوت کی تکمیل کے بعد مسلم عوام کے مسائلِ حیات آج تک دو بڑے زمروں میں تقسیم چلے آئے ہیں۔ جیسے ہر ملت کے ہوتے ہیں: دینی اور دنیاوی۔ دینی معاملات میں مسلمان قوم کو کبھی بھی کسی بڑے پیمانے پر کنفیوژن یا مغالطہ کا سامنا نہیں تھا۔ اسلام کی تعلیمات سادہ اور عام فہم ہیں۔ ایک عام بدو کو بھی ان تعلیمات کی بنیاد سمجھنے میں دقت نہ تھی۔ اس بات کا دعویٰ خود قرآن نے ایک جگہ نہیں بار بار کیا ہے۔ ارکان اسلام کی تعیّن (Classification) آسان اور مختصر ہونے کے باعث جلد ہی شاید سب مسلمانوں کی سمجھ میں آ گئی تھی اور ان پر رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں عمل بھی ہو چکا تھا۔ لہٰذا نسلوں کو ان رستوں پر چلنے کے لئے کسی خاص طبقہ علما کی ضرورت نہ تھی۔

شاید کسی بھی دین میں ایسے طبقہ علما کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن جوں جوں معاشرہ استحکام اور معمول کی طرف بڑھتا ہے، تو ایسے لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی نصِ دینی میں، کسی نہ کسی آیت میں اپنے ہونے کا جواز نکال لیتے ہیں۔ کیونکہ اپنی مہارت کے باعث باریکیوں میں جانا ایسے لوگوں کے لئے آسان ہوتا ہے اور مفید بھی۔ آہستہ آہستہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو لوگوں کو فرقہ وارنہ بحثوں، شریعت اور فقہ کی باریکیوں اور الجھی ہوئی تشریحات کے ذریعے احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے اور انھیں کے

بارے کہا گیا کہ یہ ہماری آیات کو بیچ کھاتے ہیں۔ حالانکہ یہ طبقہ اکثر اوقات ہر قسم کے معاشی عمل سے دور اور ہنر سے خالی ہونے کے باعث خود معاشرے کے رحم و کرم پر ہوتا ہے لیکن اپنی فنکاری اور مذہبی فضیلت کا اظہار کر کے عام لوگوں کو ندامت میں مبتلا رکھتا ہے۔ اس کی مثال صرف پنڈت اور پادری ہی نہیں۔

تو کیا مسلم عوام کے دینی معاملات میں کسی گروہ یا مملکت کی مداخلت یا جبر کا کوئی جواز ہے؟۔ کیا مملکت کو کسی ایسے طبقے سے سند لینے کی ضرورت ہے؟ اوپر کے صفحات میں یہ بات تفصیل سے بیان کی گئی ہے کہ زبردست سیاسی و سماجی الجھنوں کے باوجود کوئی تاریخی ثبوت اس بات کا نہیں ملتا کہ مسلم قوم مذہبی طور پر کسی الجھاؤ یا انتشار کا شکار ہوئی ہو۔ اس طرح کا الجھاؤ صرف اس وقت شروع ہوا جب مذہبی علما نے فقہ کی پیچیدہ بحثوں کے ذریعے قوم کو فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کرنا شروع کیا۔ دوسری طرف دینی جذبات کے نام پر مفلوک الحال لوگوں میں عقائد کا ضعف اور نفسیاتی کیفیات پیدا کی گئیں جن سے حشیشین اور فدائین کی روایت ابھری جو آج کے خودکش حملہ آوروں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ارکانِ دین کو اگر ایمان کی سادہ اور پرخلوص حالتوں میں چھوڑ دیا جائے تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ لوگ اپنے عقائد کی خود نگرانی کر سکتے ہیں کیونکہ انسان کا اللہ سے رشتہ کسی داروغہ کا محتاج نہیں۔ یہ دعویٰ کہ دین مولویوں اور مذہبی عالموں کی وجہ سے قائم ہے ایک بڑا مبالغہ ہے۔ جو غالباً تکبر کی ایک شکل ہے کیونکہ اس میں یہ مفروضہ موجود ہے کہ اگر مولوی کا وجود نہ ہو تو لوگوں کو اللہ کا احساس ہی نہ رہے۔

لہٰذا مسلم عوام کے مسائل حیات کے پہلے زمرے کو یعنی دینی معاملات کو نہ تو کسی دینی مملکت کی ضرورت ہے نہ ہی کسی دینی گروہ کی۔ قرآن و سنت اور احادیث میں اگر اس مقصد کے لئے حکومت قائم کرنے کا کہیں حکم آیا ہے تو اس پر قومی سطح کی کھلی بحث ضروری ہے، تاکہ عوام آئندہ انتخاب میں اس پر اپنا فیصلہ دے سکیں۔

جہاں تک ''ولتکن منکم امه '' کا تعلق ہے اور اسی ہدایت والی دوسری آیات کا، تو یہ سماجی زندگی یعنی سیکولر معاملات میں نیک مشوروں، نصیحتوں اور تلقین کی بات ہے۔ جس کا اسلوب ہمیشہ وقت اور ماحول کے مطابق متعین ہوتا ہے اور اس کا مفہوم کسی پیشہ ور گروہ کا مسلط ہو جانا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اللہ کی طرف سے نبی کو یہ ہدایت دی گئی اور بار بار دی گئی کہ وہ لوگوں پر داروغہ، نگران یا محافظ نہیں، تو یہ مقام کسی دوسرے شخص یا اشخاص کو کیسے دیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی بہت اہم ہے کہ معاشرہ کے صرف بڑے بوڑھے بزرگ اور معتبر لوگ ہی اس کام کو کریں یعنی وہ لوگ جو بالعموم پسندیدہ ہوں اور وہ یہ دیکھیں کہ معاشرے میں بگاڑ اور انتشار کی جن شکلوں کو روکنا یا سنوارنا ضروری ہے ان میں اوّل اہمیت کس کی ہے اور ثانوی کس کی۔ اور یہ سب فیصلے معاشرہ کے منتخب نمائندے باہم بحث و مشاورت سے کریں نہ کہ وہ خود ساختہ ماہرین جن کو معاشرے پر مسلط ہونے کا اختیار ملک کے کسی قانون کے تحت نہ دیا گیا ہو۔ اس کے شانہ بشانہ وہ ادارے کام کریں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یعنی قانون نافذ کرنے والے ادارے جو عوام کے ان معتبر اور منتخب نمائندوں کے ماتحت یا معاون ہوں۔

مسائل حیات کے جس زمرے میں حکومت کی موجودگی اور مداخلت ضروری ہے وہ ہے عوام کی اس زندگی کے مسائل، یعنی دنیاوی اور انسانی مسائل۔ معیشت، معاشرت، تعلیم، انصاف، امن و امان، تفریح، رسل و رسائل، دفاع اور خارجہ تعلقات جیسے ان گنت مسائل حتیٰ کہ مختلف مذاہب کے درمیان بلا تخصیص عدل اور بقائے باہمی کی ضمانت۔ یہ ہر معاشرے کی طرح مسلم معاشرہ کی حکومت کے فرائض ہیں۔ ان کی انجام دہی کے لئے وقت کے مطابق جو بھی عمدہ ترین طریقہ کار ممکن ہو اختیار کرنا اور زمانے کی اعلیٰ ترین فکری صلاحیتوں کا استعمال کرنا ہی سلامتی کا رستہ ہے، جس کے لئے اجتہاد کا حق یعنی نئے حالات میں نئے فیصلے کرنے کا حق مسلم عوام کی ہر اس حکومت کو ہونا چاہیے جو مسلمان اپنے لئے پسند کریں۔ یعنی علم و ہنر کی اس دنیا میں ہر وہ طریقہ کار اسلامی اور جائز ہے جو عوام کے دنیاوی معاملات بہتر سے بہتر طور

پر حل کرتا ہو۔ نمائندہ حکومت کو اپنے فیصلوں کے لئے کسی دینی طبقہ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ اسلام اس کا کوئی حکم نہیں دیتا نہ ہی اسلام اس خوف کا اظہار کرتا ہے کہ ایسے کسی طبقے کی عدم موجودگی میں وہ کمزور ہو جائے گا یا مٹ جائے گا۔ کیونکہ اللہ نے اپنے ذکر کی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے۔

اسلام صرف مشاورت کی ہدایت کرتا ہے۔ یہ مشاورت دین کے ماہرین سے بھی ہو سکتی ہے اور دنیاوی معاملات کے ماہرین سے بھی۔ اور فیصلوں کا حق اس جائز اتھارٹی کو ہے جسے عوام منتخب کریں۔ اسلام کسی پریشر گروپ کو دین کی اتھارٹی نہیں مانتا نہ ہی مسلم معاشروں میں دنیاوی زندگی کی تنظیم کے لئے دینی حوالوں کو کبھی ضروری قرار دیا گیا۔ سیکولرازم کا بس یہی مفہوم ہے۔

اختتامیہ

انسانی معاشرے کی مجبوری ہے کہ اسے اپنے عمل کی سمت مقرر کرنے کے لئے نظریات کی ضرورت رہتی ہے۔ ہر دور اور ہر خطہ ارض میں کسی نہ کسی نظام فکر سے یا کم از کم کسی طرز فکر سے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو راہنمائی ملتی رہی ہے۔

ہمارے ہاں جس نظریہ بلکہ جس طرز عمل کا غلبہ دکھائی دے رہا ہے اس پر کچھ بنیادی اعتراضات اٹھائے جا سکتے ہیں۔ اور یوں لگتا ہے کہ یہ اعتراضات بار بار اٹھائے جانے کی ضرورت ہے کیونکہ جب تک ان اعتراضات کا فیصلہ نہ ہو جائے، یعنی جب تک فکری سطح پر قوم انہیں قبول یا مسترد کر کے اپنا واضح نصب العین متعین نہ کر لے تب تک ہماری قومی اور عالمی زندگی کا مستقبل شائد ہوا میں لٹکا رہے گا۔

بعض غیر نمائندہ مگر منظم لوگوں نے پورے معاشرہ کو اپنے سامنے ہاتھ باندھنے اور ندامت سے سر جھکانے پر مجبور کر رکھا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے مذہبی جذبات اور عقائد کو استعمال کیا گیا ہے۔ نفرت اور تعصب کے جذبات کا اتنا غلبہ ہے کہ قومی زندگی میں عقل اور علمی دیانت کا داخلہ بند ہو گیا ہے۔ انتہائی اہم فکری معاملات میں بھی استدلال اور علم کی بنیاد پر بات نہیں ہو سکتی۔ فخر سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے لئے عشق و جنون ہی کافی ہے، کہ علم اور تحقیق کو

"اغیار" کا میدان مان کر چھوڑ دیا جائے۔

متوسط طبقوں کی وہ نسل جو جنرل ضیاء کے عشرہ اقتدار میں شعور کی ابتدائی سیڑھیوں پر تھی جس نے ضیاء کے دیئے ہوئے نظام تعلیم میں تربیت پائی، اب ہماری زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں مستعد حالت میں ہے۔اس پوری نسل کی بے منزل یکسوئی کا تجزیہ کریں، اس کی مشتعل ہونے کی صلاحیت کا مطالعہ کریں تو لگتا ہے کہ جیسے اسے زندگی اور دنیا کے بارے میں کسی ہپناسس سے گذارا گیا ہے، جیسے کوئی طلسم ہے جس نے پوری بستی کا ذہن سلا کر اسے بند آنکھوں کی سراسیمگی پر روانہ کر دیا ہے، پہلے نصاب کے جادو سے، پھر میڈیا منبر اور مدرسہ کی للکار سے اس کا فکری وجود مسخر ہوگیا ہے۔اب یہ عالمی انسانی برادری سے متنفر افراد کا ایک ہجوم ہے، جو پوری ایمانداری سے ان عقائد اور نظریات کو سچا اسلام سمجھتا ہے جو اسے نرگسیت اور جنون میں مبتلا کرنے کے لئے پڑھائے گئے تھے۔چنانچہ اب کسی بھی جدید اور خوش و خرم معاشرہ کی تعریف کر کے دیکھیں، جواب میں آپ ایک مذمتی قرارداد ہی سنیں گے۔

بہت سے شواہد اور تجزیات اشارہ کرتے ہیں کہ غالباً جنرل ضیاء کو امریکی سامراج اپنے سعودی حلیفوں کی مدد سے افغان جنگ کے لئے اقتدار میں لایا تھا جس کے منصوبے کافی دیر سے تیار ہو رہے تھے۔عالمی سامراج کے یہ دونوں دھڑے یعنی امریکی سامراج اور عربی سامراج حلیفوں کی صورت میں ایسے منصوبوں پر دیر سے کام کر رہے تھے، جن کی کامیابی مسلم معاشروں کو علم اور استدلال کے راستے سے ہٹا دے۔

امریکی سامراج کو اس کی ضرورت روس سے نمٹنے کے لئے تھی جبکہ ہمارے عرب آقاؤں کو ایک ایسے مسلم ہجوم کی ضرورت تھی جو ان کے خزانوں کی حفاظت اور ان کی عالمی مملکت کے قیام کے لئے جانوں کا نذرانہ پیش کر سکیں۔ان منصوبوں کی کامیابی کا انحصار اس پر تھا کہ شدید ترین وحشت اور جنونی کیفیتوں کو رائج کیا جائے۔عالمی تسلط کے یہ دونوں امیدوار

اس پر متفق تھے کہ مذہب ہی وہ ہتھیار ہے جس کا غلط استعمال نہایت آسان ہے اور جس کے غلط استعمال سے دلیل اور علم کا سر کچلا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ آٹھویں صدی ہجری میں کچلا گیا تھا۔

چنانچہ ایک منظم پروگرام کے ذریعے دلیل کا سر کچل دیا گیا، مسلم اقوام کے قومی تشخص گڈمڈ کئے گئے، ملت اسلامیہ اور مسلم امہ کے تصورات رائج کئے گئے جن کی بنیاد خالصتاً مہمل نفرت کے جذبات پر رکھی گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ایران میں ایک ایسا نظام برسر اقتدار لایا گیا جو مسلم امہ کے باطنی تضاد کی ضمانت فراہم کرے۔ دین کے لئے دنیا قربان کرنے، اگلے جہان کے لئے اس جہان کی ذمہ داریوں کو پس پشت ڈالنے، یعنی زندگی پر موت کو ترجیح دینے کے رویے اتنے جارحانہ فخر کے ساتھ سکھائے گئے کہ نئی نسل نے جدید علوم اور دلیل کو اپنے لئے مکروہ مان لیا۔

جدید علوم اور دلیل کی جگہ جذبات اور عقائد کو زندگی پر حاوی کرنے کا ایک فطری نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ایک عام آدمی ہی نہیں، سائنسدان، مفکر، محقق، انجینئر، ڈاکٹر، بینکر اور سیاستدان بھی مذہبی راہبر کے سامنے مرغا بن کر اپنے گناہوں اور غفلتوں کی معافی مانگنے لگ گیا۔ اور کسی کو یہ جرات نہ رہی کہ وہ مذہبی طبقوں سے سند حاصل کئے بغیر کسی بھی مسئلے پر کوئی رائے دے سکے۔

وظیفوں، دعاؤں اور عبادتوں کے کلچر میں فضیلت ہمیشہ عالم دین کی ہوتی ہے، جبکہ عالم دین کا سب سے موثر مرید وہ باعمل مرد مومن ہوتا ہے جو اس کے اشارے پر قتل کرے اور قتل ہو جائے، ایک نیند میں چلتے ہوئے معمول کی طرح جسے عامل نے اپنے کھیل کے لئے سلا دیا ہو۔ چنانچہ جذبوں کی بلند ترین شکل ایسے مسلح اور پر تشدد گروہوں کی شکل میں اس وقت موجود ہے، جو اپنے گروہی قانون کے علاوہ کسی قانون کو نہیں مانتے۔ ان گروہوں کے لئے

اپنے اپنے" حضرت صاحب، شیخ صاحب یا مولانا محترم" کا اسلامی نظریہ آخری سچائی ہے۔اس آخری سچائی میں صرف ایک چیز مشترک ہے یعنی اپنے سوا ساری دنیا کو گمراہ اور جہنمی تصور کرنا اور اپنے عقائد کے تسلط کے لئے ہر لحہ آمادۂ جنگ رہنا۔

حال ہی میں اسامہ بن لادن کی ہلاکت نے بہت سے پردے اٹھائے اور گرائے، لیکن جو پردہ القاعدہ کے بعض چھپے ہوئے کارکنوں اور حلیفوں سے اٹھا وہ اب جلدی سے گر نہیں سکے گا کہ اب القاعدہ کی جدوجہد کا ایک نیا مرحلہ یا شائد آخری مرحلہ شروع ہو چکا ہے۔میڈیا اور سیاست کے وہ کردار جو مسلسل یہ کہتے آئے ہیں کہ طالبان کا اور خود ان کا القاعدہ اور اسامہ سے تعلق محض اتنا ہے کہ جتنا ایک کلمہ گو کا دوسرے سے ہوتا ہے جبکہ ان کے نزدیک اسامہ بن لادن اور القاعدہ کا رستہ سراسر غلط رستہ ہے، وہ نہ صرف طالبان کا اصلی چہرہ چھپائے رکھنے میں ناکام ہوئے ہیں بلکہ خود بھی عریاں ہو گئے ہیں۔اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ ہمارے اہالیان اقتدار، ایجنسیوں، ہمارے مذہبی گروہوں، میڈیا اور صاحب ثروت طبقوں میں ساری دنیا سے ٹکرانے اور دنیا کو فتح کرنے کا وہ جنون کتنا گہرا ہو چکا ہے، جس کا ایک نمائندہ شیخ اسامہ بن لادن تھا۔

اسامہ بن لادن کی موت کو فوری طور پر دہشت گرد کی ہلاکت کہا گیا، لیکن چند لمحوں کے بعد میڈیا اور عوامی سطح پر یہ موقف تیزی سے تبدیل ہونے لگا اور شیخ اسامہ بن لادن کے درجات بلند ہوتے چلے گئے۔

ہماری اجتماعی فکر معقولیت سے کتنی محروم ہوئی ہے، اس کا اظہار یوں تو روز مرہ کی ٹریفک، آئے دن کی بے شمار تلخیوں، ان گنت بحثوں، سیل فون پر آنے والے پیغامات، انٹرنیٹ کے بلاگوں اور مساجد کے خطبوں میں ہوتا رہتا ہے لیکن ہماری یہ دن بدن گہری ہوتی ہوئی نرگسیت اب اس جنونی کیفیت میں داخل ہونے لگی ہے جسے نفسیات کی زبان میں پیرا نائیا

کہتے ہیں۔

عقل و دانش اور انصاف کا باہم تعلق بہت گہرا ہے۔ انصاف کا مادہ نصف سے ہے یعنی دو کے درمیان تقسیم ہو جانے کا عمل۔ کوئی شخص جب دو فریقوں کے درمیان فیصلہ کرنے بیٹھتا ہے تو اسے دونوں کے موقف میں جا کر حقائق اور دلائل کا جائزہ لینا ہوتا ہے، یوں وہ نصف ہو کر سوچنے اور جاننے کی صلاحیت کا استعمال کرتا ہے۔ عصبیت، انصاف کو کھا لیتی ہے۔ اگر وہ ایک ہی رخ سے سنے، ایک ہی طرف کا ہو کر فیصلہ کرے تو انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔

انصاف کا عمل عقل و دانش یعنی تحمل اور قوت برداشت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ ہم ان اوصاف سے اتنے متنفر ہوئے ہیں کہ اب اگر ہم میں سے کوئی ہماری توجہ ادھر مبذول کرائے تو ہمیں دشمن لگتا ہے۔ ناانصافی اور خود مرکزیت نے ہماری اجتماعی زندگی میں فکری تضاد اور جذباتی انتشار کس حد تک بھر دیا ہے، یہ ہمارے اجتماعی رویوں میں روز جھلکتا ہے۔ ہم اپنی انفرادی کامیابی، اپنے مقامی الیکشن میں فتح، اپنے ذاتی مخالف کی بربادی اور ہر طرح کے ذاتی مفاد کے لیے ہر اصول قربان کر دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ دنیا بھر کے مسلمانوں کی جنگ کو اپنی جنگ بھی کہتے ہیں۔ ہم اپنی چونچ گیلی کرنے کے لئے پورے گھڑے کو گندی کنکریوں سے بھر دیتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے مسجد سے اذان کی آواز سن کر یوں لپکتے ہیں جیسے با جماعت نماز قضا ہو گئی تو امتِ مسلمہ کو شکست ہو جائے گی یا جنت میں ہمارا داخلہ مشکوک ہو جائے گا۔ ہمیں اپنی غریب مسلم عورتوں کی اجتماعی آبروریزی اور بے بس عورتوں کا بدکاری پر مجبور کیا جانا اتنا بھی نہیں ستاتا جتنا گال پر بیٹھی مکھی لیکن ہم امریکی شہری عافیہ بی بی کے لئے تڑپ تڑپ کر بے ہوش ہوتے نظر آتے ہیں۔ جب امریکہ کی فتح کے لئے ہم روس کے خلاف لڑتے ہیں تو امریکہ مسلمانوں کی آزادی کا چیمپئن دکھائی دیتا ہے، جب وہ کویت پر صدام کا

قبضہ چھڑانے کے لئے عراق پر بموں کے قالین بچھاتا ہے تو ہم جزاک اللہ کا ورد کرتے ہیں لیکن وہی امریکہ جب سعودی عرب کی سرزمین پر خود سعودی حکومت کی اجازت سے فوج اتارتا ہے تو ہم اسامہ کی فوج بن جاتے ہیں اور ہر دہشت گردی اسلام کا لہراتا پرچم دکھائی دیتی ہے۔ جب امریکہ میں ہمارے مجاہدوں کی کارروائی سے تین ہزار شہری مرتے ہیں تو کبھی ہمارے سینے فخر سے پھول جاتے ہیں کبھی ہم اس کا الزام خود امریکیوں پر عائد کر کے بری ہو جاتے ہیں، لیکن جب وہی امریکہ یو این او کی اجازت لے کر افغان حکومت گرا دیتا ہے تو ہمیں اپنے اوپر اپنی چھتیں گرتی محسوس ہوتی ہیں۔ جب لاکھوں افغان مہاجر ہماری سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی میں غدر مچاتے ہیں، دنیا بھر سے آئے ہوئے عرب، چیچن، ازبک، برمی، حبشی حتیٰ کہ امریکی نژاد مجاہد ہماری بستیوں میں تین تین پاسپورٹوں کے ساتھ دندناتے ہیں تو اہلاً وسہلاً ومرحبا ہمارا تکیہ کلام بن جاتا ہے، لیکن غیر مسلم صرف امریکی ہی نہیں بلکہ چینی بھی، حتیٰ کہ خود ہمارا پاکستانی غیر مسلم بھی ہمارے اسلامی طیش سے محفوظ نہیں رہتا۔ سیالکوٹ میں ہمارا مسلم ہجوم لاٹھیوں کی ضربوں سے قیمہ ہوتے ہوئے لڑکوں کو دیکھ کر تالیاں بجاتا ہے یا جب کوئی "غیرت مند" خودکش مسلمان ہمارے بیسیوں مسلمانوں کے اعضاء ہوا میں اڑا دیتا ہے تو ہمارے قومی ضمیر میں خارش بھی نہیں ہوتی، لیکن ریمنڈ ڈیوس ہمارے دو شہریوں کو مار کر بھاگتا ہے تو پورا ملک اس کا تعاقب کرتا ہے اور ہفتوں مہینوں تک ہمارے سینے انتقام کی آگ میں بھٹی بنے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب ہماری آئی ایس آئی سارے معاملات طے کر کے اس امریکی کو جانے دیتی ہے تو پھر ہماری حکومت، اپنی فوج، اپنا دفتر خارجہ سب کے سب واجب القتل دکھائی دیتے ہیں۔ جب دشمن کے ڈرون پانچ دہشت گردوں کے ساتھ ان کی ڈھال بننے والے کچھ عام شہریوں کو ہلاک کر دیتے ہیں تو ہمارے غیرت بریگیڈ دانت پیس پیس کر اپنی بتیسیاں ٹیڑھی کر لیتے ہیں لیکن جب بیت اللہ محسود اور

طالبان پاکستان کے بھیجے ہوئے خودکش ڈرون حملہ کر کے ہمارے بیسیوں بے گناہ شہریوں کا قیمہ اڑا دیتے ہیں تو اسی غیرت بریگیڈ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جاتی ہیں۔ وہ نیم کھلی آنکھوں سے خبر کو دیکھتے ہیں، "یہ غیور پٹھانوں کا انتقام ہے" ہمارا ایک دانشور کہتا ہے۔ "نہیں یہ خودکش حملہ آور ہندو تھا اس کے ختنے نہیں ہوئے تھے" دوسرا دانشور بولتا ہے، یوں جیسے اس نے پھٹنے والے ڈرون لڑکے کے متعلقہ شواہد دیکھ لیے ہوں۔

ہم مدتوں قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اسامہ بن لادن ہمارے ہاں نہیں۔ پھر جب انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ساڑھے سات برس تک ہمارے سینے پر بیٹھا شائد انگھوٹھا چوس رہا تھا تو ہم کہتے ہیں جھوٹ یہ تو کوئی اور ہے، وہ تو ڈیالیسز پر تھا، وہ بھلا ڈیالسز کہاں سے کرواتا ہوگا۔ ہمارے پر اعتماد دانشور شائد اتنا بھی نہیں جانتا کہ ڈیالسس مشین دنیا بھر کے خوش حال مریض اپنے پاس رکھتے ہیں۔ یہ ہشیار دیوانہ شاید یہ بھی نہیں جانتا کہ اربوں ڈالر کے بجٹ والے اسامہ بن لادن نے گردہ ٹرانسپلانٹ کروالیا تھا جو ہمارے ہاں چند ہزار روپے میں ملتا ہے اور اسامہ کے پاس تو مرنے والے بیسیوں لوگ موجود رہے ہیں جن کے گردے اور کلیجے اس کے جانثار اپنے خنجروں سے نکالتے رہے ہیں۔

پھر جب اسامہ کے اپنے ہی خاندان سے گواہی آ جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کیا ہوا غلطی ہوگئی، ہم نے اتنے بڑے بڑے کام کئے ہیں ایک کام رہ گیا تو کیا ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ اس شہید کے درجات بلند ہونے لگتے ہیں، غائبانہ نماز جنازہ کی خبریں اور سوگوار کالم نویسوں کی آہیں، سسکیاں اور نوحے سنائی دیتے ہیں، پھر مسجد اور مدرسہ سے عالم دین کی للکار ابھرتی ہے۔ پاکستانی قوم کا مائی باپ جی ایچ کیو اور آئی ایس آئی حمیتِ قومی اور دینی غیرت سے سرخ ہونے لگتے ہیں۔ سول حکومت دانت نکال نکال کر ان دونوں کے حسن کارکردگی کی تعریف میں ٹوٹی پھوٹی غزلیں سناتی ہے۔ شہید کہ جس کا نعرہ تھا "ان صلوتی ونسکی ومحیایا ومماتی للہ رب

العالمین" (میری نمازیں، میرے انتظام، میرے زندہ اور میرے مرے ہوے، سب رب کے لئے ہیں) اپنے درجنوں بچوں کو جہاد سے دور رہنے کی اور اپنی متعدد بیویوں کو دوسری شادی نہ کرنے کی وصیت لکھ جاتا ہے تو اس کے مرثیہ خواں اور علمائے دین اس خبر کو اپنی رانوں کے نیچے دبا لیتے ہیں۔ پھر ایک بڑا ہی "معتبر" اور اسامہ کا ذاتی لنگوٹیا ہونے کا دعویدار اینکر جو اپنے کالم میں لکھتا ہے کہ 2001 میں اسے دیکھتے ہی اسامہ نے اپنی بیٹی کے پیدا ہونے کی خوش خبری سنائی تھی، اخبار میں اشتہار دیتا ہے کہ وہ اسامہ کی وصیت کی اصلیت بتائے گا، لیکن اپنے گھنٹہ بھر کے پروگرام میں اس وصیت کی بات گول کر جاتا ہے۔ امریکی ہیلی کاپٹروں کے پاکستان میں آنے پر سارا میڈیا قومی حاکمیت اعلیٰ اور سرحدوں کے تقدس کے نام پر گھائل دکھائی دیتا ہے لیکن خود اسامہ اور ہزاروں غیر ملکی دہشت گردوں کی بغیر ویزا پاکستان میں رہائش اور مورچہ بندی پر ایک لفظ نہیں کہتا۔

جب بن لادن کو قتل کیا گیا تو وہ غیر مسلح تھا۔ گرفتار کرنے اور مقدمہ چلانے کی بجائے نہتے کو قتل کرنے کا یہ مکروہ فعل قابل مذمت ہے۔ ہر باضمیر شخص نے اس کی پرزور مذمت کی ہے۔ خود امریکہ اور یورپ کے دانشوروں نے اس پر سخت احتجاج کیا ہے۔ سامراجیوں اور دہشت گردوں میں یہ قدر مشترک عجیب ہے کہ نہتے لوگوں کو گولیاں مار کر یا گردنیں کاٹ کر خود کو طاقتور سمجھتے ہیں۔

لیکن بن لادن کے وفادار دانشوروں کا یہ استدلال حیرت انگیز ہے کہ اس شہزادے نے عیش و عشرت چھوڑ کر مسلم امہ کی خاطر پہاڑوں کی تکلیف دہ زندگی چن لی۔ بے شک بڑے مقصد سے وفاداری کا ایک ثبوت بندے کی لگن ہوتی ہے جس کے لیے وہ تکلیف سہتا ہے، یا کم سے کم سادگی کی زندگی اختیار کرتا ہے۔ کیا بن لادن نے سچ مچ ایسی زندگی اختیار کی؟ کیا یہ سچ نہیں کہ شیخ نے لگ بھگ نصف درجن عورتوں سے بیاہ کیا، جن میں سے آخری

لڑکی سولہ برس کی تھی جب وہ خود گردوں کا مریض اور چھیالیس برس کا تھا۔ اس کی ایک بھی عورت تحریک سے متعلق نہ تھی یعنی سب کی سب صرف ازدواجی ضرورت کے لئے تھیں، جن سے اس کے ان گنت بچے پیدا ہوئے۔ وہ نہایت مختصر وقت پہاڑوں میں رہا، جہاں اس کی خوشامد اور خدمت کے لئے ہزاروں جانثار اور خادم موجود رہے، وہ شہزادہ اور شیخ کے نام سے مشہور تھا، جس کے اشارے پر ہزاروں قتل ہوئے اور اس نے خود کسی مشن یا لڑائی میں حصہ نہیں لیا، نہ کبھی تکلیف کا کوئی دن گزارا اور اسکے علاج کے لئے پورا ہسپتال اس کے پاس جاتا تھا۔ دور جدید کے انقلابی سربراہوں میں لینن، ماؤ، ہو چی من، چی گویرا، کاسترو، یاسر عرفات، نیلسن مینڈیلا اور نجانے کتنے ہیں جنہوں نے ایک بیوی کے ساتھ وفا کی اور ایک آدھ بچہ پیدا کیا، جسے نہ شہرت ملی نہ دولت کیونکہ اتنے بڑے مقاصد کے لئے زندگی گزارنے والوں کے پاس حیوانی خواہشوں کے لئے اُمنگ ہی نہیں بچتی۔ کہتے ہیں لینن صدر بننے کے بعد بھی اپنی بیوی کے ساتھ مرنے تک ایک کمرے کے گھر میں رہا جو مزدوروں کی بستی میں تھا۔

شیخ کی موت کا افسوس برحق مگر اس کی قربانیوں کا قصہ برحق نہیں۔ اس کی زندگی میں نہ صرف قربانی کے ثبوت ناپید ہیں بلکہ محنت، مطالعہ اور فکر و تدبر کا نشان بھی کہیں نہیں ملتا۔ یہی سبب ہے کہ اس نے نہ کچھ لکھا اور نہ زندگی کے لئے کوئی نظریہ چھوڑا۔ اس نے صرف جہالت اور جذبات کو اپنا ہتھیار بنایا اور اپنے ترکہ میں ذاتی مال و دولت اور تخریبی نفرت کے سوا مسلم امہ کے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔

اسامہ بن لادن کی شہادت یا ہلاکت نے ہماری بدنصیبی کی کئی شکلوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ بدنصیبی کو کم کرنے یا اس سے مکمل طور پر نکلنے کے لئے شرط اول انسان کا درست ارادہ ہوتا ہے، دوسرے سبھی عوامل بعد میں آتے ہیں۔ بدنصیبی کی لاکھوں شکلیں ہزاروں برس تک بنی نوع انسان کے نصیب میں رہی ہیں۔ ہم غاروں میں چھپتے رہے ہیں، ننگے ہاتھوں

سے شکار کر کے کچا پکا کھاتے رہے ہیں، اندھیروں، بیماریوں، سفاک موسموں اور طاقتور کی چیرہ دستیوں نے انسان کو ہزار صدیوں تک رلایا ہے۔ لیکن اس کے عزم نے ایک ایک کر کے ان سب دشمنوں کو شکست دی ہے۔ ان گنت محرومیاں اب بھی باقی ہیں جنہیں دور کرنا انسان کا عزم ہے۔

اب تک اگر ہم اپنے سماج میں ان پسماندہ دہشت گردوں کو پناہ دیتے یا پالتے رہے ہیں تو کل ہم اپنی کارکردگی کو بہتر بھی کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ہمارا عزم ایسا کرنے کا ہو۔ لیکن بدقسمتی کی یہ ایسی شکل ہے جو ابھی ٹلتی دکھائی نہیں دیتی۔ اس کا سبب ہماری وہ کمٹمنٹ ہے جس پر ہم سوال اٹھانے تک کی اجازت نہیں دیتے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ القاعدہ اور طالبان کی قیادت میں پوری دنیا کے خلاف چلنے والی تحریکِ تشدد سے ہماری وفاداری اب بھی ہماری کمٹمنٹ ہے۔ ہمارے میڈیا اور اسٹیبلشمنٹ کے حالیہ رویوں نے اس بات کا کھلا ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ بن لادن کی موت پر ہماری حکومت، فوج، ایجنسیوں اور میڈیا کا امریکی آپریشن کے خلاف احتجاج ایک دلچسپ منظر پیش کرتا ہے۔ ہم نے اپنی نفرت کا رُخ القاعدہ کی بجائے اس کے دشمنوں کی طرف کر دیا ہے یعنی ہمارا دشمن نمبر ایک القاعدہ کی بجائے امریکہ ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ہمارے بااختیار اور بلند آواز طبقوں کی ہمدردیاں غیر مشروط طور پر القاعدہ کے ساتھ ہیں اور امریکہ سے نفرت کی بنیاد بھی یہی ہے؟ کیا ہمارے جرنیلوں کی سربراہی میں چلنے والا ہمارا حکومتی نظام واقعی دہشت گردوں کو دہشت گرد مانتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر اسٹیبلشمنٹ کے اپنے پروردہ عناصر کی طرف سے اسامہ کو ہیرو قرار دینے، اس کے حق میں نعرے بلند کرنے اور علانیہ انتقام کا پرچار کرنے کا مقصد کیا ہے؟ اگر کہا جائے کہ اسٹیبلشمنٹ دباؤ میں ہے تو آخر یہ دباؤ کس نے پیدا کیا ہے اور اس دباؤ کو کم کرنے کے لئے اسٹیبلشمنٹ کیا کر رہی ہے؟

ہمارے نظام اجتماعی کی اس صورتحال کا بنیادی سبب کیا ہے؟

شائد یہ کہنا درست ہو کہ یہ اس مریضانہ خود پسندی یعنی تہذیبی نرگسیت کا شاخسانہ ہے جسے کم کرنے اور تنقید کا نشانہ بنانے کی بجائے مسلسل بڑھایا گیا ہے۔ یہ مریضانہ ذہنیت نااہل اور کرپٹ بادشاہوں اور علما نے پچھلی صدیوں میں پیدا کی، پھر صنعتی اقوام کے عروج کی تین صدیوں کے دوران ہماری پسماندگی اور خراب کارکردگی پر پردہ ڈالنے کے لئے اسے مزید پالا گیا۔ اب اسے جنون یعنی پیرانائیا کی شکل میں تبدیل کر کے مسلم اقوام کو تیار کیا جا رہا ہے کہ دنیا بھر سے جنگ کریں اور ایسی جنگ میں لاکھوں کروڑوں جانوں کی قربانی دے کر بھی اپنے مجنونانہ جذبوں پر نظر ثانی نہ کریں بلکہ اگر کوئی اس کا مشورہ دے تو اسے بزدلی کا طعنہ دیں۔

اب اگر ہماری اجتماعی زندگی پر اس ذہنیت کا جبر ہمیں بدحالی اور انتشار کی طرف دھکیل رہا ہے تو کیا اس پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں؟ اس کا جائزہ کبھی لیا ہی نہیں گیا۔ کیا اتنی ناکامیوں کے بعد بھی ایسے کسی جائزے کی ضرورت نہیں؟

شائد اپنی تہذیب اور اپنے لوگوں سے محبت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انہیں اکسانے اور لڑانے کی بجائے اختلاف برداشت کرنے، دنیا سے سیکھنے اور اپنی کارکردگی سنوارنے کی تربیت دی جائے۔

ایک نہایت اہم سوال یہ ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی اجتماعی جنگ کا فکری جواز کیا ہے؟ جب ہم عربوں، افغانوں، چیچنوں، یورپی اور بھارتی غرضیکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے مسائل و معاملات کو اپنا کر اور اسے اسلام کی جنگ قرار دے کر ان کے دشمنوں کو اپنے دشمن بناتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہم مسلمانوں کی اجتماعی جنگ کا اعلان کرتے ہیں، جس کی بنیاد مسلم امہ کا تصور ہے، اور یہ تصور مذہبی ہے۔ اسی بنیاد پر ہم طالبان اور القاعدہ کو اپنے رہنما اور ہیرو مانتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ہمارا وطن ان کی دھرتی اور ہمارا تن من ان پر قربان ہوتا ہے، جبکہ دنیا کی کوئی دوسری قوم مذہب کی بنیاد پر دوسری قوم کی جنگ نہیں لڑتی۔ اسلام کی اسی تشریح کی بنیاد

پر مسلم امہ کا یا کم از کم ہمارے خطہ کے مسلمانوں کا ایک مقتدر اور خوشحال طبقہ القاعدہ کی جہادی سرگرمیوں کی سرپرستی کر رہا ہے۔ القاعدہ وہ عمومی تحریک ہے جو کبھی اسلام کی عظمت اور کبھی اسکی مظلومیت کا نعرہ بلند کر کے جدید صنعتی اور علمی معیشتوں کے خلاف سرگرم ہے۔ اس کے مختلف اعضا میں طالبان طرز کی جہادی تنظیمیں شامل ہیں، جنھیں مسلم ممالک کی مقتدر قوتوں نے درپردہ حمایت کے ذریعے منظم کیا ہے۔ لیکن اس تحریک کے فکری یا قانونی جواز پر مسلم معاشروں میں کبھی تفصیلی اور علمی بحث نہیں کی گئی۔ لہذا یہ ایک اہم سوال ہے کہ اس اجتماعی جنگ کا فکری جواز کیا ہے؟

آج کی مختلف العقیدہ دنیا میں کسی جنگ کا فکری جواز عقائد پر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً یہ کہنا کہ بطور مسلمان میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کو ساری دنیا پر غالب کرنے کے لئے جہاد کروں تو یہ کوئی فکری جواز فراہم نہیں کرتا۔ فکری جواز کا تعلق ذہن سے ہے، توپ تلوار سے نہیں۔ یہ عقیدہ کسی بھی دور میں فکری جواز نہیں بن سکا۔ حتیٰ کہ جب مسلم افواج نے ایران کے حکمرانوں کو بتایا کہ ان کے پاس اللہ کی کتاب آ گئی ہے، لہٰذا اب ایران پر عربوں کا قبضہ ضروری ہو گیا ہے تو ایرانیوں نے اسے فکری جواز کے طور پر قبول نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ ہمارے پاس آپ سے بہت پہلے کتاب آئی تھی۔ اگر عرب مسلمان ایرانیوں کو قرآن حکیم پڑھنے کی دعوت دیتے یا ایرانی قوم قرآن کے فلسفہ حیات سے متاثر ہو کر اسلام کے دائرے میں آتی تو یہ تحریک اسلامی کا فکری جواز ہوتا۔ آج اگر امریکی سامراج اپنی طاقت سے کسی ملک پر قابض ہوتا ہے تو اس میں کوئی فکری جواز موجود نہیں ہوتا بلکہ سارے بہانوں کے باوجود یہ صرف طاقت کی زبان ہوتی ہے۔ عرب مسلمانوں نے ایرانیوں کے خلاف یہ موقف کبھی اختیار نہیں کیا کہ وہ اپنے ملک میں اسلام کی دعوت پھیلانے کی اجازت نہیں دیتے، کیونکہ ایسا کوئی واقعہ تاریخ میں موجود نہیں کہ مسلم مبلغین کو ایران میں قتل کیا گیا ہو یا انہیں داخل ہونے سے روکا گیا

ہو یا بار بار کوششوں کے باوجود اسلام کی روشنی کو ایرانی عوام وخواص تک پہنچنے نہ دیا گیا ہو۔ مسلم افواج کا پیغام بس اتنا تھا کہ اسلام قبول کرلو تو ہمارے بھائی ہو ورنہ جزیہ دو ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ایسے ہی اگر آج دنیا کی کوئی قوم ہمیں کہے کہ اسلام چھوڑ کر ہمارا نظریہ قبول کر لو تو ہم تمہیں بھائی مان لیں گے، ورنہ ٹیکس ادا کرو ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، تو یہ دعوت فکری دعوت نہیں کہلائے گی۔

آج کی دنیا میں کہیں بھی مسلمانوں کی کسی فکری دعوت کو روکا نہیں گیا، نہ اسلام کی تبلیغ کو، نہ ہمارے سفارتی موقف کو، جسے پوری تیاری کے ساتھ پیش کرنے کی ہم کوشش ہی نہیں کرتے، کیونکہ اس کے لئے انکسار، علم اور ثبوت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ فکری تحریکوں کو روکنے کا رجحان صرف ہمارے مسلم معاشروں میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً جمہوریت اور سیکولر نظام حکومت کی فکری تحریکیں۔ حالانکہ یہ اصولِ سیاست کسی دین کے خلاف نہیں، کسی کو اپنے عقائد ترک کرنے کے لئے نہیں کہتے، اس کے باوجود القاعدہ اور اس کے زیر اثر علما کی منظم طاقت ان نظریات پر بحث کی بجائے انہیں پرتشدد اور جذباتی کارروائیوں کے ذریعے روکتی ہے، جبکہ مسلم معاشروں میں اسلام کے مخالف نظریات کا تو ذکر تک کرنا بھی موت کو دعوت دینا ہے۔

اب سادہ سا سوال یہ ہے کہ جدید تہذیبوں سے ہماری نفرت کا فکری جواز کیا ہے؟ یا القاعدہ کی غلبہ اسلام اور خلافت کی تحریک کا فکری جواز کیا ہے؟ اسلام ایک نظریہ ہے، کیا اس نظریہ کو دنیا کے کسی ملک نے اشاعت سے روکا ہے؟ اگر ہمیں آزادی ہے کہ دنیا بھر کی اقوام کو اپنے افکار کی طرف دعوت دیں اور ہم ہر جگہ ایسا کر رہے ہیں تو پھر وہ کون سی فکری تحریک ہے جس کے لئے ہمیں جہاد کی ضرورت ہے؟ اگر جہاد اس لئے ہے کہ اسلام کی تبلیغ سے روکنے والوں کی طاقت کو توڑ دیا جائے، تو پھر دنیا میں واحد ملک شائد چین ہے جہاں

اسلام کی تبلیغ کی کھلی اجازت نہیں۔ دوسرا ملک ہمارے علم میں نہیں۔ تو پھر القاعدہ، طالبان، اخوان المسلمون اور ایسی ہی کسی جہادی تحریک کا فکری جواز کیا ہے؟

فکری جواز کی ایک شکل وہ افادیت ہے جو کسی فکر میں موجود ہوتی ہے۔ یعنی جیسے سائنسی علوم کا فکری جواز صرف ان کا منطقی استدلال ہی نہیں بلکہ وہ افادیت بھی ان کا فکری جواز ہے جو ان علوم کے نتیجے میں کسی معاشرے کو حاصل ہوتی ہے۔ کیا ایسی کوئی افادیت تحریک خلافت یا القاعدہ کی تحریکِ جہاد میں موجود ہے؟ اگر ہے تو اس کو بیان کرنے میں یا لوگوں کو اس کے قبول کرنے میں کیا دقت ہے؟

ایک اور فکری جواز عوام کی اجتماعی امنگ بھی ہے یعنی اگر کوئی نظریہ عوام کی اکثریت کو پسند ہے، لوگ اس فکری سانچے میں ڈھل کر اپنی زندگی کو آسودہ بنا سکتے ہیں تو پھر یہ بھی اس نظریے کے نفاذ کا فکری جواز کہا جا سکتا ہے۔ آج پاکستان، افغانستان، بھارت اور بیشتر عرب ممالک میں لوگ اسلام کے تمام نظریاتی پہلوؤں کی ہر تفصیل سے واقف ہیں۔ پاکستان میں تو ہمارے علما، مساجد، مدارس اور مذہبی جماعتوں کے علاوہ ہماری مسلح افواج نے ہر طریقہ سے ہمارے عوام کو رات دن نہ صرف اسلام سکھایا ہے بلکہ مسلح گروہوں کے ذریعے اس کی ایسی دھاک بٹھائی ہے کہ ہمارے عیسائی بھی کلمہ و درود کے بغیر بات کرنے کو مہم جوئی سمجھتے ہیں۔

اگر اتنے یک طرفہ پرچار کے بعد ہمارے عوام اسلامی نظام کے نفاذ کو ووٹ دے دیں تو پھر بھی اعتراض کرنے والے کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ کسی دوسرے نقطہ نظر کو پیش کرنے کی اجازت ہی نہیں دی گئی لہٰذا یہ فیصلہ نہ تو منصفانہ ہے نہ ہی فکری۔ لیکن اگر ہمارے عوام انتخابات میں اسلامی جماعتوں اور جہادی گروہوں کو حکمرانی کے لئے منتخب ہی نہ کریں تو پھر یہ فکری جواز بھی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ کیا ایسے حالات میں تشدد کی کارروائیوں سے عوام کی زندگی کو حرام کر کے، انہیں سراسیمگی، طوائف الملوکی اور اضطراب میں مبتلا کر کے اقتدار پر بزور بندوق

قبضہ کرنا فکری جواز ہے؟ کیا فکری نہیں تو پھر اسے قانونی یا اخلاقی یا کون سا جواز کہیں گے؟

اگر طاقت ہی کا استعمال جواز ہے تو کیا ہم ہی رستم زمان ہیں جن کی طاقت سے دنیا لرزتی ہے؟ اس طرز فکر کے نتائج میں کتنے بھیانک المیے چھپے ہیں، یہ سوچنا اور جاننا ہر اس شخص پر لازم ہو گیا ہے جو ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے محبت سے سوچتا ہے۔ شیخ اسامہ بن لادن نے اپنے درجن بھر بچوں کے لئے جو سوچا وہ ہمارے سامنے ہے۔ کیا ہمیں اپنے کروڑوں بچوں کے لئے ایسا سوچنا منع ہے؟

جرات تحقیق www.RealisticApproach.org جرات تحقیق

Jurat-e-Tehqiq

جرات تحقیق www.RealisticApproach.org جرات تحقیق